Sa'adat Hasan Manto
Thandā gosht
Delhi: Mashvarah Buk Dipo, 1960

جملہ حقوق بحق پبلشر محفوظ ہیں

نومبر ۱۹۶۰ء

ناشران
مشورہ بک ڈپو
رام نگر گاندھی نگر پوسٹ بکس 1639 دہلی ۶

قیمت فی کتاب صرف ایک روپیہ

دلی پرنٹنگ ورکس دہلی

مُقدّمہ!

جو ٹھنڈا گوشت پر چلایا گیا

بمبئی چھوڑ کر کراچی سے ہوتا ہوا غالباً سات یا آٹھ جنوری ۱۹۴۸ء کو یہاں لاہور پہنچا۔ تین مہینے میرے دماغ کی عجیب و غریب حالت رہی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہیں کہاں ہوں بمبئی میں ہوں۔ کراچی میں اپنے دوست حسن عباس کے گھر بیٹھا ہوں یا لاہور میں ہوں جہاں کئی ریستورانوں میں قائدِ اعظم فنڈ جمع کرنے کے سلسلے میں رقص و سرود کی محفلیں اکثر جمتی تھیں۔

تین مہینے تک میرا دماغ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پردے پر ایک ساتھ کئی فلم چل رہے ہیں۔ آپس میں گڈ مڈ۔ کبھی بمبئی کے بازار اور اس کی گلیاں۔ کبھی کراچی کی چھوٹی چھوٹی تیز رفتار ٹریمیں اور گدھا گاڑیاں اور کبھی لاہور کے پرشور ریستوران — سمجھ میں نہیں آتا تھا میں کہاں ہوں — سارا دن کرسی پر بیٹھا خیالات میں کھویا رہتا۔ آخر ایک دن چونکا کیونکہ جو روپیہ میں بمبئی سے اپنے ساتھ لایا تھا کچھ تو گھر میں اور کچھ گھر سے کچھ دور کلفٹن بار میں جذب ہو چکا تھا۔ اب مجھے قطعی طور پر ... ہو گیا کہ میں لاہور میں ہوں۔ جہاں کبھی کبھی میں اپنے مقدمات کے سلسلے میں آیا کرتا تھا اور کرنال شاپ سے بہت سے خوبصورت چپل خرید کر اپنے ساتھ

لے جایا کرتا تھا۔

میں نے سوچنا شروع کیا کہ اب کیا کام کیا جائے۔ استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ تقسیم کے بعد فلمی کاروبار قریب قریب مفلوج ہو چکا ہے۔ جن فلم کمپنیوں کے بورڈ نظر آتے ہیں۔ وہ ان بورڈوں ہی تک محدود ہیں۔ بہت تشویش ہوئی۔ الامنٹوں کا بازار گرم تھا۔ مہاجر اور غیر مہاجر دھڑا دھڑ اپنے اثر و رسوخ سے کارخانے اور دوکانیں الاٹ کرا رہے تھے۔ مجھے مشورہ دیا گیا۔ مگر میں نے اس لوٹ کھسوٹ میں حصہ نہ لیا۔

انہی دنوں معلوم ہوا کہ فیض احمد فیض اور چراغ حسن حسرت مل کر ایک روزنامہ جدید خطوط پر شائع کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ میں ان حضرات سے ملا۔ اخبار کا نام امروز تھا جو آج ہر ایک کی زبان پر ہے۔ پہلی ملاقات پر اخبار کی "ڈمی" تیار کی جا رہی تھی۔ دوسری ملاقات ہوئی تو "امروز" کے غالباً چار پرچے نکل چکے تھے۔ اخبار کی گٹ اپ دیکھ کر جی بہت خوش ہوا۔ طبیعت میں اُلجھاوٹ پیدا ہوئی کہ لکھوں۔ لیکن جب لکھنے بیٹھا تو دماغ کو منتشر پایا۔ کوشش کے باوجود ہندوستان کو پاکستان سے اور پاکستان کو ہندوستان سے علیحدہ نہ کر سکا۔ بار بار دماغ میں یہ الجھن پیدا کرنے والا سوال گونجتا۔ کیا پاکستان کا ادب علیحدہ ہوگا۔ اگر ہوگا تو کیسے ہوگا۔ وہ سب کچھ جو سالم ہندوستان میں لکھا گیا تھا اس کا مالک کون ہے۔ کیا اس کو بھی تقسیم کیا جائے گا۔ ....

..... کیا ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے بنیادی مسائل ایک جیسے نہیں۔ کیا ادھر اردو بالکل ناپید ہو جائے گی۔ یہاں پاکستان میں اردو کیا شکل اختیار کرے گی۔ کیا ہماری اسٹیٹ مذہبی اسٹیٹ ہے۔ اسٹیٹ کے تو ہم ہر حالت میں وفادار رہیں گے۔ مگر کیا ہمیں حکومت پر نکتہ چینی کی اجازت ہوگی۔ آزاد ہو کر کیا

یہاں کے حالات فرنگی عہدِ حکومت کے حالات سے مختلف ہوں گے۔

گرد و پیش جدھر بھی نظر دوڑاتا تھا انتشار ہی انتشار دکھائی دیتا تھا۔ کچھ لوگ بے حد خوش تھے کیونکہ ان کے پاس ایک دم دولت آگئی تھی لیکن اس خوشی میں بھی انتشار تھا۔ جیسے وہ بکھر کر ایک دن ہوا ہو جانے والی ہے۔ اکثر مغموم و متفکر تھے کیونکہ وہ لٹ پٹ کر آئے تھے۔ مہاجروں کے کیمپ دیکھے۔ یہاں خود انتشار کے رنگ گھڑے دیکھے۔ کسی نے کہا اب تو حالات بہت بہتر ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے کی حالت دیدنی تھی۔ میں سوچنے لگا اگر یہ حالات کی بہتری ہے تو ابتری معلوم نہیں کیسی ہوگی۔ غرض کہ عجیب افراط و تفریط کا عالم تھا۔ ایک کا قہقہہ دوسرے کی آہ سے دست و گریباں تھا۔ ایک کی زندگی دوسرے کے عالمِ نزع سے مصروف پیکار تھی۔ دو دھارے بہہ رہے تھے۔ ایک زندگی کا دھارا ایک موت کا۔ ان کے درمیان خشکی تھی جس پر گرسنگی و تشنگی شکم سیری و بلانوشی ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔ فضا پر مردنی طاری تھی۔ جس طرح گرمیوں کے آغاز میں آسمان پر بے مقصد اڑتی ہوئی چیلوں کی چیخیں اُداس ہوتی ہیں اسی طرح "پاکستان زندہ باد" اور "قائداعظم زندہ باد" کے نعرے بھی کانوں کو اُداس اُداس لگتے تھے۔

ریڈیو کی لہریں اقبال مرحوم کا ایک آہنگ کلام شب و روز اپنے کاندھوں پر اُٹھا اُٹھا کر تھک اور اکتا گئی تھیں۔ فیچر پروگرام کچھ اس قسم کے ہوتے تھے کہ مرغیاں کس طرح پالی جاتی ہیں۔ جوتے کیسے بنائے جاتے ہیں۔ فن دباغت کیا ہے۔ رفیوجی کیمپوں میں کتنے آدمی آئے اور کتنے گئے۔

قریب قریب تمام درخت ننگے بچے تھے۔ سردیوں سے بچنے کے لیے غریب مہاجرین نے ان کی چھال اُتار کر اپنی کھال گرم کی تھی۔ ٹہنیاں کاٹ کر

پیٹ کی آگ ٹھنڈی کی تھی۔ ان ننگے بُچے درختوں سے فضا اور بھی دل شکن حد تک اُداس ہو گئی تھی۔

بلڈنگوں کی طرف دیکھتا تھا تو ایسا محسوس ہوتا تھا سوگ میں ہیں۔ ان کے مکین بھی ماتم زدہ تھے۔ بظاہر ہنستے تھے۔ کھیلتے تھے۔ کوئی کام مل جاتا تھا تو وہ بھی کرتے تھے مگر گویا یہ سب کچھ خلا میں ہو رہا تھا۔ ایک ایسے خلا میں جو لبالب ہونے پر بھی خالی تھا۔

میں اپنے عزیز دوست احمد ندیم قاسمی سے ملا۔ ساحر لدھیانوی سے ملا۔ ان کے علاوہ اور لوگوں سے بھی ملا۔ سب میری طرح ذہنی طور پر مفلوج تھے۔ میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ جو اتنا زبردست بھونچال آیا ہے۔ شاید اس کے کچھ جھٹکے آتش فشاں پہاڑ میں اٹکے ہوئے ہیں۔ باہر نکل آئیں تو فضا کی نوک پلک درست ہوگی۔ پھر صحیح طور پر معلوم ہو سکے گا کہ صورتِ حالات کیا ہے۔

سوچ سوچ کر میں عاجز آ گیا تھا۔ چنانچہ آوارہ گردی شروع کر دی۔ بے مطلب سارا دن گھومتا رہتا تھا۔ خود خاموش رہتا لیکن دوسروں کی سُنتا رہتا ـــ بے ہنگم باتیں، بے جوڑ دلیلیں، خام سیاسی مباحثے ـــ اس آوارہ گردی سے یہ فائدہ ہوا کہ میرے دماغ میں جو گرد و غبار اڑ رہا تھا آہستہ آہستہ بیٹھ گیا اور میں نے سوچا کہ ہلکے پھلکے مضامین لکھنا چاہئیں، چنانچہ میں نے "ناک کی قسمیں"، "دیواروں پر لکھنا" جیسے فکاہیہ مضامین "امروز" کے لئے لکھے جو پسند کئے گئے ـــ آہستہ آہستہ مزاح خود بخود طنزیہ رنگ اختیار کر گیا۔ یہ تبدیلی مجھے بالکل محسوس نہ ہوئی۔ میں لکھتا گیا اور میرے قلم سے "سوال پیدا ہوتا ہے" اور "سویرے جو کل آنکھ میری کھلی" جیسے تیز و تند مضمون نکل گئے ـــ جب مجھے اس امر کا احساس ہوا کہ میرے قلم نے گرد و پیش چھائی ہوئی دھند میں ٹٹول ٹٹول کر ایک راستہ تلاش کر لیا ہے تو مجھے

خوشی ہوئی۔ دماغ کا بوجھ بھی کسی قدر ہلکا ہو گیا۔ میں نے زور شور سے لکھنا شروع کر دیا۔ مضامین کا یہ مجموعہ بعد میں "تلخ، ترش اور شیریں" کے عنوان سے شائع ہوا۔

طبیعت افسانے کی طرف مائل نہیں ہوتی تھی۔ اس صنفِ ادب کو میں بہت سنگین سمجھتا ہوں۔ اس لئے افسانہ لکھنے سے گریز کرتا تھا۔ لیکن انہی دنوں میرے عزیز دوست احمد ندیم قاسمی جو غالباً اوٹ پٹانگ چیزیں لکھ لکھ کر تنگ آ گئے تھے۔ ریڈیو پاکستان پشاور سے علیحدہ ہو کر لاہور چلے آئے اور "ادارہ فروغِ اُردو" کے اشتراک سے ایک ماہنامہ پرچہ "نقوش" جاری کیا۔ ان کے اصرار کے باوجود میں "نقوش" کے پہلے چند پرچوں کے لئے کوئی کہانی نہ لکھ سکا۔ جب وہ ناراض ہو گئے تو میں نے پاکستان میں اپنا پہلا افسانہ "ٹھنڈا گوشت" لکھا جو میرے اس مجموعے کا اب عنوان ہو گیا ہے۔

قاسمی صاحب نے یہ افسانہ میرے سامنے پڑھا۔ وہ خاموش پڑھتے رہے۔ مگر مجھے اُن کا ردِ عمل معلوم نہ ہو سکا۔ افسانہ ختم کرنے کے بعد انھوں نے مجھ سے معذرت بھرے لہجے میں کہا: "منٹو صاحب معاف کیجئے۔ افسانہ بہت اچھا ہے لیکن "نقوش" کے لئے بہت گرم ہے۔"

قاسمی صاحب سے کبھی بحث نہیں ہوئی تھی اس لئے میں نے خاموشی سے افسانہ واپس لے لیا اور ان سے کہا: "بہت بہتر۔ تو میں آپ کے لئے دوسرا افسانہ لکھ دوں گا۔ آپ کل شام تشریف لے آئیے گا۔"

قاسمی صاحب جب دوسرے روز شام کو تشریف لائے تو میں اپنے دوسرے افسانے "کھول دو" کی اختتامی سطور لکھ رہا تھا۔ میں نے قاسمی صاحب سے کہا: "ایک منٹ ـــ آپ بیٹھئے میں افسانہ مکمل کر کے آپ کو دیتا ہوں" ـــ اس افسانے کی اختتامی سطور چونکہ بہت ہی اہم تھیں اس لئے قاسمی صاحب کو کافی دیر انتظار کرنا پڑا۔

جب افسانہ مکمل ہوگیا تو میں نے مسودہ ان کے حوالے کر دیا "پڑھ لیجئے۔ خدا کرے آپ کو پسند آجائے۔"

قاسمی صاحب نے افسانہ پڑھنا شروع کیا۔ اختتامی سطور پر پہنچے تو میں نے نوٹ کیا جیسے کسی نے ان کو جھنجھوڑ دیا ہے ــ افسانہ ختم کرنے کے بعد وہ کچھ نہ بولے میں نے ان سے پوچھا "کیسا ہے؟"

قاسمی صاحب پر افسانے کا اثر ابھی تک غالب تھا مختصراً کہا "اچھا ہے ــ میں لئے جاتا ہوں" ــ اور آپ رخصت لے کر چلے گئے۔

"کھول دو" قاسمی صاحب کے پرچے "نقوش" میں شائع ہوا۔ قارئین نے پسند کیا ہر ایک کا ردعمل یکساں تھا۔ آخری سطور سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی تھیں لیکن ایک دم ہم سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دینے والا حادثہ وقوع پذیر ہوا۔ حکومت کو یہ افسانہ امن عامہ کے مفاد کے منافی نظر آیا۔ چنانچہ حکم ہوا کہ "نقوش" کی اشاعت چھ مہینے تک بند رہے۔ اخباروں میں حکومت کے اس اقدام کے خلاف احتجاجاً بہت کچھ لکھا گیا مگر امتناعی حکم اپنی جگہ پر قائم رہا۔

میں نے ایک روز قاسمی صاحب سے مسکرا کر کہا "اگر آپ "ٹھنڈا گوشت" شائع کرتے تو شاید یہ بجلی آپ کے آشیانے پر نہ گرتی۔"

کافی دن گذرنے پر "ادبِ لطیف" کے نائب مدیر میرے پاس آئے اور "ٹھنڈا گوشت" لے گئے ــ افسانے کی کتابت ہوئی۔ کاپیاں جم گئیں۔ پروف نکل آئے۔ غلطیاں درست کرکے جب واپس پریس میں گئیں تو کسی کی نظر "ٹھنڈا گوشت" والی کاپی پر پڑی۔ اس نے افسانہ پڑھا تو چھاپنے سے انکار کر دیا۔ قہر درویش برجان درویش اس افسانے کے بغیر ہی پرچہ شائع کیا گیا۔

چودھری برکت علی صاحب کوئٹے میں تھے واپس آئے تو انھوں نے "ادب لطیف"

کے دوسرے شمارے میں "ٹھنڈا گوشت" چھپوانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ افسانے کا مسودہ مجھے واپس دے دیا گیا۔

اس دوران میں کراچی سے محترمہ ممتاز شیریں کے متعدد خط آچکے تھے کہ میں ان کے "نیا دور" کے لئے کوئی افسانہ بھیجوں میں نے اٹھا کر "ٹھنڈا گوشت" ان کو روانہ کر دیا۔ کافی دیر کے بعد جواب آیا کہ ہم دیر تک سوچتے رہے کہ اسے شائع کیا جائے یا نہیں۔ افسانہ بہت اچھا ہے۔ مجھے بہت پسند ہے لیکن ڈر ہے کہ حکومت کے احتساب کے شکار نہ ہو جائیں۔ "ٹھنڈا گوشت" یہاں سے بھی ٹھنڈا ہوکر واپس میرے پاس پہنچ گیا۔ میں نے سوچا اب اسے کسی رسالے میں نہیں چھپوانا چاہئے۔

چھ مہینے کی عدت پوری نہیں ہوئی تھی کہ حکومت نے "نقوش" پر سے "نہ چھاپو" والی قید ہٹادی۔ چنانچہ میں نے "نیا ادارہ" کے لئے ایک مجموعہ مرتب کیا جس کا عنوان میں نے "نمرود کی خدائی" رکھا۔ اس میں "کھول دو" کے ساتھ میں نے "ٹھنڈا گوشت" بھی شامل کر دیا۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ عزیزی عارف عبدالمتین رسالہ "جاوید" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تو آپ میرے پیچھے پڑ گئے کہ میں ان کو "ٹھنڈا گوشت" کا مسودہ اشاعت کے لئے دوں۔ کافی دیر کی ٹال مٹول کے بعد آخرکار ان کے پیہم اصرار پر میں نے "نیا ادارہ" کے مالک چودھری نذیر احمد صاحب کو ایک چٹ لکھ دی کہ یہ "جاوید" والے اپنا پرچہ ضبط کرانا چاہتے ہیں ــ براہ کرم ان کو "ٹھنڈا گوشت" کا مسودہ دے دیجئے۔ عارف صاحب افسانے کا مسودہ لے آئے۔ اور اسے "جاوید" کے خاص نمبر مطبوعہ مارچ ۱۹۴۹ء میں شائع کر دیا۔

پرچہ چھپ کر مارکیٹ میں آگیا۔ اندرونی اور بیرونی ایجنسیوں میں بھی تقسیم ہو گیا یہاں تک تو خیریت رہی۔ ایک مہینہ گذر گیا۔ میں مطمئن ہو گیا کہ اب "ٹھنڈا گوشت"

پر کوئی آفت نہیں آئے گی۔ مگر پریس برانچ کی باگیں ابھی تک چودھری محمد حسین صاحب (اب مرحوم) کے ہاتھ میں تھیں۔ گو ضعیفی کے باعث ان کے ہاتھ بہت کمزور ہو چکے تھے مگر انھوں نے زور کا ایک جھٹکا دیا اور پولیس کی مشینری حرکت میں آگئی۔

میں نے ایک روز اڑتی اڑتی سنی کہ چھاپہ پڑا ہے اور پولیس "جاوید" کے خاص نمبر کے پرچے اٹھا کر لے گئی ہے میں نے جان پہچان کے چند لوگوں سے پوچھا کسی نے اس خبر کی تصدیق کی کسی نے کہا: "ابی ہٹائیے۔ یہ جاوید والوں کا پبلسٹی اسٹنٹ ہے" اس دوران میں "جاوید" کے مالک مسٹر نصیر انور کا رقعہ ملا۔

منٹو صاحب!

ایک خبر سنئے ــــ آج پولیس نے دفتر "جاوید" پر چھاپہ مار تلاشی لینے پر بچے کھچے چند پرچے اپنے قبضے میں لے لیئے۔ باقی پرچوں کی جانچ پڑتال ہوئی تو ڈسپیچ رجسٹر نے واضح کر دیا کہ تمام پرچہ ہند و پاک کے مختلف اسٹیشنوں پر سپلائی ہو چکا ہے۔

رجسٹر میں سے تمام ایجنسیوں کے پتے نوٹ کر لیئے گئے اور آئندہ سپلائی کا حساب کتاب بند کر دیا گیا۔ یہ کارروائی گرفتاری کا پیش خیمہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ جلد ہی ملزموں کے کٹہرے میں ہوں گے۔ لیکن ایک اور بات قابلِ ذکر ہے کہ ایک مقامی ادارہ اس چھاپے کو اختراع اور پروپیگنڈے سے منسوب کرتا ہے مجھے حیرت ہے کہ ایسا کیوں ہے۔

خیر اس کی تصدیق خود بخود ہو جائے گی مجھے تو یہ کہنا ہے کہ اب ذرا وہیں چلیئے جہاں تین بار سزا پانے پر آپ بری قرار دیئے گئے میرا خیال ہے کہ یہ بار آخری بار ہو گی"

خبر کی تصدیق ہو گئی۔ معاملہ پریس ایڈوائزری بورڈ کے سامنے پیش ہوا جس کے کنوینر کرنل فیض احمد فیض اڈیٹر پاکستان ٹائمز تھے۔ اس میں "جاوید" کے مالک مسٹر نصیر انور بھی موجود تھے۔ ان کی زبانی اس میٹنگ کی مختصر روئداد سنیئے۔

پاکستان ٹائمز کے دفتر میں پریس ایڈوائزری بورڈ کی میٹنگ تھی فیض احمد فیض کنوینر تھے۔ میٹنگ میں ایف ڈبلیو بسٹن (سول ملٹری گزٹ) مولانا اختر علی (زمیندار) حمید نظامی (نوائے وقت) وقار انبالوی (سفینہ) اور امین الدین صحرائی (جدید نظام) شریک تھے۔ چودھری محمد حسین نے "جاوید" کا خاص نمبر پیش کیا۔ آپ نے سب سے پہلے پرچے کے باغیانہ اور اشتعال انگیز مضامین نظم و نثر گنوائے "غلامی سے آزادی تک"۔ "رقص بسمل" ــــ "سیلاب چین"۔ یہ تھیں نظمیں۔ مضامین میں سے "لوزینگ سے فلیٹی تک" ــــ "کھیڑا بہادر کی جے" اور "چین کتنی دور ہے"۔ زیر بحث لائے گئے۔ فیض حکومت کے عائد کردہ الزام کی تردید کرتے رہے۔ دیگر اراکین نے ہاں میں ملائی اور یوں یہ الزام ٹل گیا۔ لیکن "نزلہ گرا" "ٹھنڈا گوشت" پر۔ فیض نے جب اسے غیر فحش قرار دیا تو مولانا اختر علی گرج اٹھے "نہیں نہیں اب ایسا ادب پاکستان میں نہیں چلے گا" جناب صحرائی نے اس پر صاد کیا۔ وقار صاحب نے افسانے کو ملعون و مطعون قرار دیا حمید نظامی نے نوائے وقت کا ساتھ دیا۔ اور جب ایف۔ ڈبلیو بسٹن کو چودھری صاحب نے انگریزی میں ٹھنڈا گوشت سمجھایا تو مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ فرمانے لگے "اس کہانی کی تھیم یہ ہے کہ ہم مسلمان اتنے بے غیرت ہیں کہ سکھوں نے ہماری مردہ لڑکی تک نہیں چھوڑی ......" مجھے ہنسی تو آگئی تھی۔ لیکن جب چودھری

صاحب غلط ترجمانی پر مُصر رہے تو مجھے افسوس ہوا۔ میں نے لاکھ سمجھایا۔ فیض صاحب نے بھی ہر طرح سے اطمینان دلایا۔ لیکن فیصلہ یہ ہوا کہ اب عدالت ہی اس کا فیصلہ کرے۔

چنانچہ چند دن بعد میں، نصیر انور اور عارف عبدالمتین گرفتار کر لیے گئے۔ گرفتار کرنے والے سب انسپکٹر چودھری خدا بخش تھے۔ بے حد شریف۔ کئی دن میرے مکان کے چکر کاٹتے رہے۔ ان دنوں میں اکثر باہر ہوتا۔ آخر ایک روز وہ مجھ سے ملنے میں کامیاب ہو گئے۔ بڑے اخلاق سے پیش آئے اور کہا "کل صبح کسی دوست کے ساتھ تھانہ سول لائنز میں تشریف لے آئیے گا۔ تاکہ آپ کی ضمانت ہو جائے"۔ اس سے پہلے کئی مرتبہ مجھے پولیس کے آدمیوں سے پالا پڑ چکا تھا۔ چودھری خدا بخش صاحب کا نرم رویہ مجھ پر بہت اثر انداز ہوا۔

دوسرے روز صبح کو میں تھانے میں حاضر ہو گیا۔ میرے دوست شیخ سلیم نے دستخط کیے اور ہم مقدمے کے پہلے مرحلے سے فارغ ہو گئے۔

عارف عبدالمتین بہت ہی پریشان تھے۔ ان کا حلق خشک ہو جاتا تھا۔ یہ حیرت کی بات ہے۔ کیونکہ وہ کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم کارکن ہیں۔ عدالت سے خدا معلوم کیوں اتنے خائف تھے۔ بہرحال سمن جاری ہوئے۔ سماعت کی تاریخ مقرر ہوئی اور ہم تینوں ضلع میں حاضر ہوئے۔

میرے لیے یہ جگہ کوئی نئی جگہ نہیں تھی۔ اپنے پچھلے تین مقدموں کے سلسلے میں یہاں کئی مرتبہ آ چکا تھا اور دھول پھانک چکا تھا۔ نام تو ضلع کچہری ہے لیکن بے حد غلیظ جگہ ہے۔ مچھر، مکھیاں، کیڑے مکوڑے ــــ چنگڑیوں اور ریڑیوں کی جھنکاریں نہایت ہی دقیانوسی ٹائپ رائٹروں کی اکتا دینے والی ٹپ ٹپ تین ٹانگوں والی کرسیاں جن کی نشست کا نیچہ ہی غائب ہے۔ دیواروں پر سے پلستر اکھڑ رہا ہے

باغ ہے جس کا لان افلاس زدہ میلے کچیلے کشمیری کے سر کی طرح گنجا ہے۔ برقع پوش عورتیں ننگے گندے بچے اُٹھائے ہوئے فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھی ہیں۔ کوئی گندی گالیاں بک رہا ہے۔ کوئی بسور رہا ہے۔ اندر کمروں میں مجسٹریٹ صاحبان نہایت ہی واہیات میزوں کے پاس بیٹھے مقدموں کی سماعت فرما رہے ہیں۔ پاس دوست یار بیٹھے ہیں۔ دورانِ سماعت ان سے بھی گفتگو جاری رہتی ہے۔

الفاظ ضلع کچہری کی صحیح تصویر نہیں کھینچ سکتے۔ یہاں کی فضا الگ۔ یہاں کا ماحول الگ۔ یہاں کی زبان الگ۔ یہاں کی اصطلاحات الگ۔ عجیب و غریب جگہ ہے۔ خدا اس سے دور ہی رکھے۔

آپ کو نقل لینی ہو تو درخواست کے ساتھ "پہیے" لگانے پڑیں گے۔ کوئی مثل دیکھنے کے لیے نکلوانی ہو تو بھی "پہیے" لگانے پڑیں گے۔ کسی افسر سے ملنا ہو تو بھی "پہیے" لگانے پڑیں گے۔ اگر کام فوری کرانا ہو تو پہیوں کی تعداد بڑھ جائے گی۔ غور سے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ کی آنکھیں دیکھ سکتی ہیں تو آپ کو ضلع کچہری میں ہر عرضی پہیوں پر چلتی نظر آئے گی۔ ایک دفتر سے دوسرے دفتر تک چار پہیے۔ دوسرے دفتر سے تیسرے دفتر تک جانے کے لیے "آٹھ پہیے" وقس علیٰ ہذا ــــ اگر آپ عادی مجرم نہیں تو آپ کے دل میں یہ زبردست خواہش پیدا ہو گی کہ کوئی آپ کے پہیے لگا دے اور دھکا دیدے تاکہ آپ ضلع کچہری سے باہر نکل جائیں۔

وکیل کا سوال درپیش تھا۔ عدالت میں حاضر ہونے سے پہلے جناب تصدق حسین خالد سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے کمال مہربانی سے خود ہی کہا کہ وہ ہمارے مقدمے کی پیروی کرنے میں مسرت محسوس کریں گے۔ چنانچہ ان کو ہی تکلیف دی گئی۔

خالد صاحب آئے۔ ہم ملزمین میاں اے ایم سعید پی سی ایس مجسٹریٹ درجہ اول کی عدالت میں پیش ہوئے۔ میاں صاحب موصوف کسی زمانے میں کپتانی کے عہدے

پر فائز تھے۔ مگر اب اُن سے بندوق لیکر عدل و انصاف کی ترازو ان کے ہاتھ میں دے دی گئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی تیز آنکھیں۔ چھریرا بدن۔ رنگ سانولا۔ کرسی پر بڑی تمکنت سے بیٹھے تھے۔ ہم طریق سلام کر کے کٹہرے میں کھڑے ہوئے تو آپ ہماری طرف دیکھے بغیر میاں تصدق حسین خالد کی طرف متوجہ ہوئے۔ ایک بار پھر ضمانتیں ہوئیں۔ اس کے بعد دوسری سماعت کی تاریخ مل گئی۔ ہم نے میاں سعید صاحب کو سلام کیا اور عدالت سے باہر نکل آئے۔ جون کا مہینہ تھا۔ سب کے حلق خشک تھے مگر عارف عبدالمتین کا حلق بالکل لکڑی ہو رہا تھا۔ کاش وہاں کوئی پارٹی ممبر ہوتا۔

دو تین پیشیاں اس طرح بھگتے۔ موسم ظالمانہ حد تک گرم ہو چکا تھا۔ لیکن "قہر درویش برجان درویش" آواز پڑنے تک عدالت کے باہر کھڑے رہتے کیونکہ ڈر تھا کہ اگر ہم اِدھر اُدھر ہو گئے تو مجسٹریٹ صاحب کا قہر نازل ہو جائے گا۔ شروع ہی سے ان کا رویہ بہت سخت تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ پہلے ہی سے اپنے دل میں ہمارے خلاف فیصلہ مرتب کر چکے ہیں۔ میاں خالد نے مجھ سے کہا "کیوں نہ ہم اس عدالت سے اپنا مقدمہ منتقل کرا لیں۔ مجسٹریٹ کا رویہ مخاصمانہ ہے"۔ میں نے کہا "میاں صاحب چھوڑیئے۔ دوسری عدالت میں مقدمے گئے تو کیا ہمیں وہاں لڈو پیڑے کھلائے جائیں گے۔ رہنے دیجئے مقدمے کو یہیں"۔

میاں خالد مان گئے۔ چنانچہ دو تین پیشیاں بھگتے۔ استغاثے کی طرف سے مسٹر محمد یعقوب ولد میاں غلام قادر منیجر کپور آرٹ پریس لاہور۔ شیخ محمد طفیل حلیم اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ ڈی سی آفس لاہور۔ سید ضیاء الدین احمد مترجم پریس برانچ پنجاب گورنمنٹ اور چند اور حضرات رسمی طور پر پیش کیے گئے۔

سید ضیاء الدین نے کہا کہ میری رائے میں "ٹھنڈا گوشت" تمام کا تمام فحش ہی

میاں خالد نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ جہاں تک مصنف کی کوشش کا تعلق ہے وہ نیک ہے۔ مگر اندازِ اظہار اور استعمالِ الفاظ غلط ہے۔ میاں خالد نے گواہ سے ایک اور سوال کیا: "کیا مصنف کو اپنے کردار کے منہ میں ایسے الفاظ نہیں ڈالنے چاہئیں جو اس کی صحیح شخصیت پیش کریں"۔ سید صاحب نے جواب دیا "جس قسم کا کردار ہو ویسے ہی الفاظ استعمال کرنے چاہئیں"۔ آپ نے یہ بھی تسلیم کیا کہ مصنف کا یہ کام ہے کہ وہ اچھے بُرے کردار تخلیق کرے۔

شہادتِ استغاثہ ختم ہوئی۔ مجسٹریٹ صاحب نے حسبِ ضابطہ رسمی طور پر ہم سے چند سوال کیے جن کا مختصر جواب دے دیا گیا۔ یہ سلسلہ عدالتی زبان میں "اظہار ملزم بلا حلف" کہلاتا ہے اور کچھ اس قسم کا ہوتا ہے۔

سوالِ عدالت۔ آپ پر الزام ہے کہ آپ نے بحیثیت مصنف مضمون "ٹھنڈا گوشت" جو کہ رسالہ "جاوید" کے خاص نمبر میں بغرضِ اشاعت نصیر انور پرنٹر و پبلشر ملزم ہمراہی اور عارف عبدالمتین اور نصیر انور اڈیٹر رسالہ مذکور کو جو کہ فحش تھا دیا۔ یہ جرم زیر دفعہ ۲۹۲ تعزیراتِ ہند کی تعریف میں آتا ہے۔ آپ وجہ ظاہر کریں کہ کیوں نہ آپ کو اس جرم کی سزا دی جائے؟

جواب۔ (یہ جواب خالد صاحب نے میری طرف سے دیا) میں نے افسانہ "ٹھنڈا گوشت" جاوید میں بغرضِ اشاعت دیا۔ لیکن وہ فحش نہیں تھا اور نہ میں اسے فحش تصور کرتا ہوں۔ یہ افسانہ اصلاحی ہے۔

سوالِ عدالت۔ مقدمہ کیوں بنایا گیا؟

جواب۔ پولیس بہتر جانتی ہے۔ اس کا نقطۂ اخلاق و اصلاح ہم سے مختلف ہے۔

سوالِ عدالت۔ کچھ اور کہنا چاہتے ہو؟

جواب: اس موقع پر نہیں۔

اب ہم سے صفائی کے گواہوں کی فہرست پیش کرنے کے لیے کہا گیا۔ یہ فہرست ہم نے پہلے ہی سے تیار کر رکھی تھی۔ چنانچہ فوراً پیش کر دی گئی۔ میاں سعید صاحب نے جب تئیس نام دیکھے تو خفا ہو گئے۔ کہا: "میں اتنا ہجوم نہیں بلا سکتا۔" میاں خالد نے اصرار کیا کہ ہر گواہ اپنی جگہ پر بہت اہم ہے۔ میاں سعید نے اپنے انداز میں مضحکہ اڑانے کی کوشش کی۔ ممتاز شیریں صاحبہ کا نام پڑھا تو ارشاد کیا: "یہ ممتاز شانتی کون ہے؟" عدالت کے آدمی میاں صاحب کے اس مذاق پر ہنسے ہم ہونٹ بھینچے خاموش رہے۔

بڑی مشکلوں کے بعد مجسٹریٹ صاحب درجہ اوّل چودہ گواہ بلانے پر راضی ہوئے۔ چنانچہ فہرست پر نشان لگا دیئے گئے۔ سمن جاری ہوئے۔ میں کسی گواہ سے نہ ملا۔ کیونکہ میں چاہتا تھا کہ ہر ایک میرے افسانے کے متعلق اپنی بے لاگ رائے دے تاکہ مجھے اپنی صحیح پوزیشن معلوم ہو سکے۔

جن گواہوں کے سمن کی تعمیل ہو چکی تھی ان کو صبح سویرے عدالت میں حاضر ہونا پڑتا تھا۔ میں بے حد شرمندہ تھا۔ کیونکہ غریب کام کاج چھوڑ کر کئی کئی گھنٹے باہر کھڑے رہتے تھے۔ ہم تو ملزم تھے لیکن ان کی حالت بھی ہم جیسی تھی۔ ہم اندر کٹہرے میں کھڑے رہتے تھے۔ اور وہ عدالت کے باہر لوہے کے جنگلے کے ساتھ لگے انتظار کرتے رہتے تھے کہ انہیں کب آواز پڑتی ہے۔

میرے دوست شیخ سلیم کی حالت قابلِ رحم تھی۔ صبح شام پینے کا عادی۔ سارا وقت جمائیاں لیتا رہتا تھا۔ آخر اس سے یہ اذیت برداشت نہ کی گئی۔ چھوٹی [illegible]ں میں وہسکی بھر کے لے آتا اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پیتا رہتا۔ ادیبوں سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں۔ لیکن جب دوسروں سے باتیں کرتا تو یہی کہتا "آخر فحاشی ہے کیا۔ منٹو کا افسانہ "ٹھنڈا گوشت" میں نے پڑھا

نہیں لیکن یہ فحش نہیں ہو سکتا۔ منٹو آرٹسٹ ہے"

ہماری طرف سے پہلے گواہ سید عابد علی عابد ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی پرنسپل دیال سنگھ کالج لاہور تھے۔ آپ نے بیان دیتے ہوئے کہا: میں نے رسالہ جاوید میں "ٹھنڈا گوشت" پڑھا ہے۔ یہ ایک ادب پارہ ہے۔ منٹو صاحب کی میں نے تمام تصانیف پڑھی ہیں۔ پریم چند کے بعد جو مختصر افسانہ نگار مشہور ہوئے ان میں سعادت حسن منٹو کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس افسانے سے ایشر سنگھ کے کردار کا نمایاں ترین اثر یہ ہے کہ اس نے جو ناروا حرکت کی۔ اس کی سزا اسے فطرت کی طرف سے نفسیاتی طور پر مل گئی"

عدالت کے ایک سوال پر عابد صاحب نے کہا: "ولی سے لیکر غالب تک سب وہ چیز جسے فحش کہا جاتا ہے۔ لکھتے چلے آئے ہیں۔ لٹریچر کبھی فحش نہیں ہوتا جو ایک بار لٹریچر قرار دیا جا چکا ہو"

استغاثہ کی طرف سے سوال کیا گیا: "کیا ادب مقصود بالذات ہے"

عابد صاحب نے جواب دیا: "میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ادب تنقیدِ حیات ہے اور اس میں اس سوال کا جواب شامل ہے۔ ہر معقول انسان کے قول یا فعل کا مطلب ہوتا ہے۔ لیکن تمام انسان معقول نہیں ہوتے۔ ہر قول یا فعل سوسائٹی کی نظروں میں اچھا یا بُرا ہو سکتا ہے۔ اچھے اور بُرے فعل جانچنے کے لیے بے شمار معیار ہوتے ہیں"

استغاثہ کے ایک اور سوال کے جواب میں عابد صاحب نے کہا: "یہ افسانہ میرے سب بچوں اور بچیوں نے پڑھا ہے۔ میری ایک لڑکی جو فورتھ ایئر میں پڑھتی ہے اس سے کئی بار سیکس پر علمی بحث ہو چکی ہے۔ جو اس کے نصاب کا جزو ہے" پھر آپ نے کہا: "خاص آدمیوں سے جو کہ ادیب ہیں اس افسانے کے بارے میں میرا تبادلۂ خیالات ہوا۔ سب نے اس کو بہت سراہا"

صفائی کے دوسرے گواہ مسٹر احمد سعید پروفیسر نفسیات دیال سنگھ کالج لاہور تھے۔ آپ نے اپنے بیان میں کہا کہ افسانہ "ٹھنڈا گوشت" فحش نہیں ہے۔ اس میں ایک بہت بڑا نفسیاتی مسئلہ ہے۔ ان کے نزدیک لفظ فحش کی کوئی بنیاد ہی نہیں دوسرے الفاظ میں فحاشی ایک اضافی چیز ہے۔ ذہنی طور پر بیمار اشخاص پر "ٹھنڈا گوشت" پڑھنے سے برا اثر ہو سکتا ہے۔

تیسرے گواہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ایم۔ اے۔ ایل ایل بی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ سابق ڈائریکٹر آف ایجوکیشن کشمیر تھے۔ آپ نے اپنے بیان میں کہا "انسانی نفسیات کے اندر جو خیر و شر ہے، ادیب کا یہ کام ہے کہ وہ اس کو اس انداز سے پیش کرے کہ جس سے انسانی زندگی کے حقائق سمجھنے میں مدد مل سکے۔ برے کردار کو اس انداز سے پیش کرے کہ اس کی برائی دیکھ کر نفرت پیدا ہو۔"

خلیفہ صاحب نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا "زیر بحث افسانے کے کردار ایشر سنگھ سے شدید کراہت اور نفرت پیدا ہوتی ہے۔ یہ کردار بالکل صحیح ہے۔ ایسے کردار بعض خاص کیفیتوں کے ماتحت جسمانی حالت درست ہونے کے باوجود نفسیاتی بیمار ہو سکتی ہے۔"

ان تین گواہوں کے بیان ایک پیشی میں ہو گئے جو کہ خاصے طویل تھے اور ایک ایک لفظ خود مجسٹریٹ صاحب کو لکھنا پڑتا تھا اس لیے وہ جھنجھلا جھنجھلا جاتے تھے۔ کئی بار آپ نے تنگ آ کر کہا "میں مجسٹریٹ ہوں یا محرر" لیکن بہرحال انہیں اپنا فرض ادا کرنا ہی پڑتا تھا۔

اس پیشی میں ایک بڑی دلچسپ بات ہوئی۔ میرے ہاتھ میں سگریٹوں کا ڈبہ غالباً کریون اے کا تھا۔ مجسٹریٹ صاحب کی نظر پڑی تو آپ نے مجھے ایک بہت بڑی ڈانٹ پلائی "یہ گھر نہیں ہے ــ عدالت ہے۔" میں نے مودبانہ عرض کیا "لیکن

حضور میں پی تو نہیں رہا ہوں۔" آپ نے اور زیادہ گرم ہو کر کہا "خاموش رہو۔ ڈبہ اپنی جیب میں رکھو۔" میں نے حکم کی تعمیل کی ــ مجسٹریٹ صاحب درجہ اول نے میز پر سے اپنا سگریٹ کا ٹن اٹھایا اور ایک سگریٹ سلگا کر پینا شروع کر دیا ــ اور میں ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا اس کا بکھرا ہوا دھواں پیتا رہا۔

اگلی پیشی پر میاں تصدق حسین خالد تشریف نہ لائے۔ کیونکہ ان کے گھر میں کوئی علیل تھا۔ ہمیں تاریخ مل گئی۔ اس تاریخ پر بھی میاں صاحب موصوف تشریف نہ لائے۔ ان کا لڑکا ولایت سے واپس آ رہا تھا۔ وہ کراچی اس کے استقبال کے لیے چلے گئے تھے۔ ہم سخت الجھن میں گرفتار ہو گئے۔ میں نے مجسٹریٹ صاحب سے مودبانہ گذارش کی کہ ہمیں تاریخ دے دی جائے اس لیے کہ ہمارا وکیل موجود نہیں ــ آپ نے اس سے انکار کر دیا۔ اور حکم دیا کہ کارروائی شروع ہو۔

میں بہت سٹپٹایا۔ گواہ کو آواز دی گئی۔ ڈاکٹر سعید اللہ ایم۔ اے۔ ایل ایل بی۔ پی ایچ ڈی۔ ڈی ایس سی (ان دنوں پاکستان ایئر فورس کے سویلین آفیسر) تشریف لائے۔ اب میں سوچنے لگا کیا کروں۔ مگر شاید اس لیے کہ خاندان کے سب بزرگ وکیل اور باپ سب جج تھے۔ دو بڑے بھائی بیرسٹر ہیں اور اس لحاظ سے خون میں کسی قدر قانون گھلا ہوا تھا۔ میں نے میاں تصدق حسین صاحب خالد کی جگہ سنبھال لی۔ اور اپنے گواہ نمبر ۴ ڈاکٹر سعید اللہ صاحب سے بیان دلوانا شروع کر دیا۔ بات بات پر مجسٹریٹ صاحب مجھے ٹوکتے "تم اس طرح سوال نہیں کر سکتے ــ تم یہ بات نہیں پوچھ سکتے ــ" میں ڈٹا رہا۔

ڈاکٹر صاحب کا آدھا بیان ختم ہوا تھا کہ عدالت کے کمرے میں چار نوجوان وکیل کالے کوٹ پہنے بڑے چست۔ بڑے بانکے داخل ہوئے اور ڈاکٹر سعید اللہ صاحب کے پاس کھڑے ہو گئے۔ ایک جس کی پتلی پتلی مونچھیں تھیں اور جس کا رنگ

بانی دوسرے مقابلے میں کسی قدر سانولا تھا۔ میرے ساتھ کٹہرے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب مجھے سانس لینے کا موقع ملا تو اس نے میرے کان میں کہا: "منٹو صاحب کیا ہم آپ کے مقدمے کی پیروی کر سکتے ہیں؟" میں نے کچھ نہ سوچا اور کہا: "جی ہاں آپ کر سکتے ہیں" چنانچہ پتلی پتلی مونچھوں والے اس نوجوان وکیل نے پیروی شروع کر دی۔ مجسٹریٹ صاحب نے اس سے پوچھا — "آپ کیسے؟"

وکیل نے مسکرا کر جواب دیا: "حضور میں ان کا وکیل ہوں۔ کیوں منٹو صاحب؟" — میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کارروائی شروع ہوئی۔ اس وکیل کے باقی تینوں ساتھی بھی حصہ لینے لگے۔ ان کی سرگرمی میں بڑا دلکش لڑکپن تھا۔ وہ جو کالج کے زندہ دل طلباء میں ہوتا ہے — مجسٹریٹ جھنجھلا گئے۔ آپ نے ان تینوں سے پوچھا: "آپ حضرات کیوں بیچ میں بول رہے ہیں؟" — انھوں نے جواب دیا: "حضور ہم ملزموں کے وکیل ہیں — کیوں منٹو صاحب؟" — میں نے پہلے کی طرح سر ہلا دیا۔

ڈاکٹر سعید اللہ صاحب نے اپنے بیان میں جو کچھ کہا میں اسے مختصراً پیش کرتا ہوں۔ — آپ نے فرمایا: "ٹھنڈا گوشت" پڑھنے کے بعد میں خود ٹھنڈا گوشت بن گیا۔ پژمردگی اور افسردگی، یہ تھا اس کا اثر۔ یہ افسانہ ہیجان ہرگز پیدا نہیں کرتا۔ ایشر سنگھ کا کردار پیش کرنے کے لیے مصنف نے دو تین دفعہ گالی استعمال کی ہے۔ مگر شاید فنکار نے اسے مناسب سمجھا ہو۔ مگر گالی کی شکل اس نے اس طرح بدلی ہے کہ گالی معلوم نہیں ہوتی۔ اگر وہ گالی جو ایشر سنگھ نے استعمال کی ہے، گالی بھی رہتی تو بھی میرے نزدیک افسانہ فحش نہ ہوتا۔ گالی فحش بھی ہو سکتی ہے اور فحش نہیں بھی ہو سکتی۔ اگر فن کار صحیح فن کار ہے تو وہ گالی کو بغیر ضرورت کبھی استعمال نہیں کرتا۔ اس افسانے میں گالی کا استعمال فن کارانہ ہے"

پروفیسر کیو ڈر صاحب بڑے نستعلیق قسم کے آدمی تھے۔ بہت بانکے۔ کج کلاہ۔ گردن میں ہلکا سا شاندار خم آنکھوں پر "رم لیس" چشمہ جسے وہ بار بار اپنی ناک سے اتارتے اور چڑھاتے تھے۔ آپ نے ازراہِ تمسخر کچھ کہا تو ڈاکٹر صاحب برس پڑے اس زور سے کہ دوسرے کمرے میں صوفی تبسم صاحب کرسی پر اچھل کر باہر نکل آئے بہر حال معاملہ ٹل گیا۔

پروفیسر کیو ڈر صاحب نے جن کا نام غالباً محمد اقبال تھا ڈاکٹر صاحب سے پوچھا "نفسِ مضمون کے لحاظ سے مختلف ادبا کو مختلف القاب دیئے گئے ہیں۔ مثلاً راشد الخیری کو مصورِ غم۔ اقبال کو مصورِ حقیقت اور خواجہ حسن نظامی کو مصورِ فطرت ...... آپ ..... ؟

ڈاکٹر صاحب نے اقبال کی بات کاٹ کر کہا: "میں "ٹھنڈا گوشت" کے مصنف کو مصورِ حیات کا لقب دوں گا"

اب کرنل فیض احمد فیض ایڈیٹر پاکستان ٹائمز کی باری آئی۔ آپ نے اپنے بیان میں کہا: "میری رائے میں افسانہ فحش نہیں ہے۔ ایک افسانے کے الگ الفاظ کو فحش یا غیر فحش کہنے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ افسانے پہ تنقید کرتے وقت مجموعی طور پہ تمام افسانہ زیرِ نظر ہوگا اور ہونا چاہیئے۔ محض عریانی کسی چیز کے فحش ہونے کی دلیل نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس افسانے کے مصنف نے فحش نگاری نہیں کی لیکن ادب کے اعلیٰ تقاضوں کو بھی پورا نہیں کیا۔ کیونکہ اس میں زندگی کے بنیادی مسائل کا تسلی بخش تجزیہ نہیں ہے"

جرح کے جواب میں فیض صاحب نے کہا: "اگر موضوع تقاضہ کرے تو میں ایسے الفاظ کا استعمال جائز سمجھتا ہوں۔ اگرچہ یہ الفاظ پارلیمنٹری نہیں، لیکن ادبی اعتبار سے جائز ہیں"

فیض صاحب کے بعد صوفی غلام مصطفےٰ صاحب قسیم پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور تشریف لائے۔ آپ نے اپنے بیان میں کہا: "افسانہ "ٹھنڈا گوشت" لوگوں کے اخلاق کو خراب نہیں کرتا۔ ہو سکتا ہے اس کے بعض فقرے الگ ہو کر فحش ہوں اور بعض نہ ہوں۔ انسانی جنسیات کو ادب کا موضوع بنا کر ہمارے لٹریچر کا رجحان ایک صحیح سمت کی طرف جا رہا ہے۔"

جرح کا جواب دیتے ہوئے صوفی صاحب نے فرمایا: "کوئی افسانہ یا ادب پارہ فحش نہیں ہو سکتا جب تک لکھنے والے کا مقصد ادب نگاری ہے۔ ادب بحیثیت ادب کے کبھی فحش نہیں ہوتا۔"

اقبال صاحب نے اپنی ناک پر سے کئی مرتبہ جلدی جلدی "رم جھم" چشمہ اتارا اور جمایا تو صوفی صاحب کو گھیر گھار کر اپنے مطلب کی بات کہلوانا چاہتے تھے۔ مگر صوفی صاحب طفل مکتب نہیں تھے۔ بیس برس سے اُستادی کرتے چلے آئے تھے اقبال صاحب کے جال میں نہ پھنسے۔ ایک مرتبہ تو آپ نے صاف کہہ دیا۔ دیکھئے صاحب آپ لاکھ الٹ پھیر کریں لیکن میں وہی کچھ کہوں گا جو مجھے کہنا ہے۔"

اقبال صاحب نے سوال کیا: "اگر کسی تحریر یا افسانے یا ادب پارے کے نتائج تخریب الاخلاق ہوں مگر مصنف کا مقصد تخریب اخلاق نہ ہو تو آپ اس افسانے کو فحش کہیں گے یا نہیں؟"

صاف ظاہر تھا کہ اقبال صاحب کیا چاہتے ہیں۔ صوفی صاحب نے مسکرا کر جواب دیا: "نہیں۔ اس لئے کہ پڑھنے والوں کے اپنے ذہنی رجحانات شامل ہو جائیں گے نہ کہ مصنف کا مطلب۔ تخلیق ادب مصنف اپنی طبع سے مجبور ہو کر کرتا ہے یہ تخلیق اوروں کے لئے بھی ہوتی ہے۔"

اقبال صاحب نے ایک اور سوال کیا: "اگر اس تصنیف سے لوگوں کے

اخلاق پر برا اثر پڑے تو اس کی ذمہ داری ادیب پر ہوگی یا نہیں؟"

صوفی صاحب نے کھٹ سے جواب دیا: "وہ بری الذمہ ہے۔"

اقبال صاحب نے عاجز آ کر پوچھا: "آخر مخرب اخلاق تحریر کیا ہے؟"

صوفی صاحب نے جواب دیا: "وہ تحریر جس سے لکھنے والے کا مقصد محض تخریب اخلاق ہو۔"

اقبال صاحب نے ناک پر اپنا "رم جھم" چشمہ جمایا اور گردن کو ذرا اور خمیدہ کر کے جرح بند کر دی۔

ڈاکٹر آئی۔ لطیف ہیڈ آف دی سائیکولوجی ڈیپارٹمنٹ ایف سی کالج لاہور بلائے گئے۔ میں نے ان کا نام سنا تھا لیکن دیکھا کبھی نہیں تھا۔ آپ صوفی صاحب کے بیان کے دوران میں میاں سعید صاحب کے پاس بیٹھے تھے اور رسالہ "جاوید" کا خاص نمبر ان کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے ان کی طرف غور ہی نہیں کیا تھا۔ جب وہ بیان دینے لگے تو میں نے انہیں غور سے دیکھا۔ سب سے پہلے مجھے ان کی تیکھی مونچھیں نظر آئیں۔ آپ نے رسالہ ایک طرف رکھا اور کہنا شروع کیا: "میں نے "ٹھنڈا گوشت" ابھی ابھی پڑھا ہے۔ یہ ایک غلط رسالے میں چھپا ہے۔ میرا مطلب ہے یہ افسانہ ایک پاپولر رسالے میں نہیں چھپنا چاہیئے تھا۔ اگر یہ کسی سائنٹفک رسالہ میں کیس ہسٹری کے طور پر ایسے الفاظ تائید یا تردید میں چھپتے تو اس پر فحاشی کا الزام عائد نہیں ہو سکتا تھا۔ جن الفاظ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ بولنے میں ان کو برا سمجھتا ہوں لیکن کیس ہسٹری میں یہ الفاظ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔"

خدا معلوم کیا بات ہوئی کہ ڈاکٹر لطیف نے ایک دم پوچھا: "مسٹر منٹو کون ہیں؟" میں نے جواب دیا: "جناب یہ خاکسار ہے۔" ڈاکٹر صاحب کی تیکھی مونچھیں تھرتھرائیں۔ آپ نے مجھ سے کچھ نہ کہا اور بیان دینے میں مشغول ہو گئے۔ وکیل صاحب نے میرے

گواہ میں کہا: "منٹو صاحب آپ کا یہ گواہ تو ہوسٹائل ہوگیا ہے۔ اب آپ اس پر جرح کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا: "جانے دیجئے۔"

لیکن وکیل صاحب نے جرح کر ہی دی۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر لطیف صاحب نے کہا: "افسانہ ایسے رسالے میں جس کو ہر بچہ بوڑھا۔ لڑکا لڑکی پڑھ سکے نہیں چھپنا چاہیے تھا کیونکہ ایسی طبائع جو جذبات کو مشتعل کرنے والے تاثرات قبول کرنے والی ہوں یہ افسانہ پڑھ کر مشتعل ہوں گی۔"

جرح ختم ہوئی۔ ڈاکٹر لطیف صاحب میرے پاس آئے ہاتھ ملایا اور کہا "آپ نے مجھے گواہی کے لیے بلایا تھا تو کم از کم مل لیے ہوتے۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا "انشاء اللہ اب ملاقات کا شرف حاصل کروں گا۔"

ڈاکٹر صاحب نے پھر ہاتھ ملایا اور چلے گئے۔

اب میں ان چار نوجوان وکیلوں کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں جو بڑے ڈرامائی انداز میں میرے مقدمے میں داخل ہوئے تھے۔ پتلی پتلی مونچھوں، تیکھی ناک اور سانولے رنگ والے شیخ خورشید احمد تھے۔ کافی ہاؤس ان کے بغیر نامکمل ہے۔ دوسرے تین تھے۔ مسٹر مظہر الحق، مسٹر سردار محمد اقبال اور مسٹر اعجاز محمد خاں۔ آپ لوگوں کو بار روم میں معلوم ہوا کہ میں خود اپنا کیس کنڈکٹ کر رہا ہوں اور پریشان ہوں تو وہ میری مدد کے لیے چلے آئے۔ میں نے ان کا شکریہ مناسب و موزوں الفاظ میں ادا کیا۔

شیخ خورشید احمد نے کہا: "اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن داد دیجئے کہ میں نے آپ کا افسانہ "ٹھنڈا گوشت" پڑھا کیا دیکھا تک نہیں۔"

ہم سب خوب ہنسے۔ شیخ نے کہا: "اور میں شرط لگانے کے لیے تیار ہوں کہ مسٹر اقبال نے بھی یہ افسانہ ابھی تک نہیں پڑھا۔"

ہماری طرف سے سات گواہ اب تک پیش ہوئے تھے بقایا گواہوں کو بلانے کے لیے جب شیخ خورشید صاحب نے عدالت سے درخواست کی تو مسترد کر دی گئی۔ مجسٹریٹ صاحب نے اس خیال سے کہ ہمارا پلڑا وزنی ہے۔ عدالت کی طرف سے چار گواہ طلب کیے۔ مولانا تاجور نجیب آبادی۔ شورش کاشمیری، ابو سعید بزمی اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر۔

کئی تاریخیں بھگتیں مگر یہ حضرات جمع نہ ہوئے۔ آخر ایک تاریخ پر سب آ گئے۔ تاجور صاحب سے علیک سلیک ہوئی تو آپ نے لیکچر پلانا شروع کر دیا کہ میں ایسے غلیظ فحش اور واہیات افسانے لکھتا ہوں۔ میں خاموش سنتا رہا اس لیے کہ مولانا کے ساتھ بحث کرنا فضول تھا۔

آغا شورش بڑے پُرشور طریقے سے ملے۔ ابو سعید بزمی نے مجھ سے ایک سگرٹ لیا اور سلگا کر ٹہلنے لگے۔ آواز پڑی تو حاضرِ عدالت ہوئے۔ کارروائی شروع ہوئی۔ پہلے گواہ منجانب عدالت شمس العلماء مولانا احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی پروفیسر دیال سنگھ کالج لاہور تھے۔ آپ نے فرمایا "ٹھنڈا گوشت" کسی سجد میں کسی مجلس میں جماعتی حیثیت میں سنا پسند نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی پڑھے تو سر سلامت لے کر نہ جا سکے۔ چالیس سالہ ادبی زندگی میں ایسا ذلیل اور گندہ مضمون میری نظر سے نہیں گذرا۔

میں نے مولانا سے چند سوال کیے تو آپ نے جواباً کہا: "یہ افسانہ میں نے پہلی بار دیال سنگھ کالج میں پڑھا لیکن پورا نہیں پڑھا۔ تھوڑا سا پڑھا اور لغو سمجھ کر بند کر دیا۔ مثنوی گلزارِ نسیم میں بکاؤلی اور تاج الملوک کی شادی کا تذکرہ اخلاق سے متصادم ہے۔ فسانۂ عجائب۔ مثنوی بہارِ عشق۔ مثنوی فریبِ عشق اور الف لیلیٰ میں جو

فحش سمجھتے ہیں وہ فحش ہیں۔ حکایت خانم و کنیز کا ذکر مثنوی مولانا روم میں آتا ہے لیکن میں نے نہیں پڑھا۔ جنسی ترغیب کا پہلو مثنوی مولانا روم میں نہیں ہو سکتا۔

جی چاہتا تھا کہ مولانا کو خوب ستاؤں مگر میں نے مناسب خیال نہ کیا اور چند سوال اور کرکے ان کو چھوڑ دیا۔ اب آغا شورش کاشمیری ولد آغا نظام الدین اڈیٹر ہفتہ وار "چٹان" مونچھوں کے اندر مسکراہٹیں بکھیرتے تشریف لائے۔ میری طرف دیکھ کر آپ کھل کے مسکرائے اور بیان دینا شروع کر دیا۔

آپ نے فرمایا: "جہاں تک میرے علم اور احساسات کا تعلق ہے میں نے "ٹھنڈا گوشت" سے اچھے تاثرات فراہم نہیں کیے میں جس سماج اور گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس کے پیش نظر میں ایسا مضمون اپنے پرچے میں شائع نہیں کروں گا میرا مدرسۂ فکر اسے گوارا نہیں کرتا۔"

استغاثے کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے آغا صاحب نے کہا: "اس سے اوباش قاری کو ترغیب ہوتی ہے۔ ان لوگوں کو جن کا رجحان طبیعت خاص طور پر بدکاری کی طرف مائل ہو۔"

ہماری طرف سے آغا صاحب پر کوئی جرح نہ کی گئی۔ ابو سعید بزمی اڈیٹر "احسان" لاہور پیش ہوئے تو آپ نے افسانے کو مخرب اخلاق قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ "افسانہ معنی و مطلب کی وجہ سے قابل اعتراض ہے۔"

میں نے بزمی سے پوچھا: "کیوں حضرت یہ بتائیے کیا اسی عدالت میں آپ کے خلاف ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ چل رہا ہے۔" آپ نے جب "جی ہاں" کہا تو مجسٹریٹ صاحب نے حیرت سے پوچھا: "میری عدالت میں؟" بزمی صاحب نے پھر جواب دیا: "جی ہاں۔" مجسٹریٹ صاحب نے قلم سے سر کھجا کر پائپ سلگایا اور اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔

آخری گواہ منجانب عدالت پیش ہوئے یعنی ڈاکٹر تاثیر صاحب پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور۔ آپ نے اپنے بیان میں کہا: "کہانی ادبی لحاظ سے ناقص ہے لیکن بے ادبی۔ نشان لگائے ہوئے الفاظ کچھ اس کہانی کے لیے ضروری ہیں۔ کچھ غیر ضروری۔ کچھ الفاظ ایسے الفاظ ہیں جن کو ناشائستہ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن میں فحش اس لیے نہیں کہتا کہ لفظ فحش کی تعریف کے متعلق میں واضح نہیں ہوں۔ میرے خیال میں جن لوگوں کا میلان بدکاری کی طرف ہے۔ ان کے لیے اس مضمون میں جنسی ترغیب موجود ہے جس شخص کی طبع میں میلان بدکاری نہ ہو اسے اس مضمون سے جنسی کراہت ہوگی۔ جنسی ترغیب نہیں ہوگی۔ "ٹھنڈا گوشت" کا مطلب مردہ لڑکی ہے۔ میں اس کہانی کو ایک عام جنسی کہانی سمجھتا ہوں یہ جنسی اخلاق خراب نہیں کرتی۔"

عدالت کی تمام کارروائی ختم ہوئی۔ اب فیصلہ باقی تھا جو میاں اے ایم سعید صاحب سماعت کے دوران میں کئی مرتبہ زبانی سنا چکے تھے۔ شیخ خورشید احمد کو یقین تھا کہ ہم سب کو جرمانہ ہوگا۔ فیصلے کی تاریخ سولہ جنوری رہی۔ سال ہفتہ ہوئی۔ نصیر انور بالکل بے پروا تھا۔ ساری سماعت کے دوران میں وہ ہنستا مسکراتا رہا۔ عارف عبدالمتین البتہ سارا وقت بہت پریشان رہے۔ ان کی اس پریشانی کا باعث یہی تھا کہ ان کے معمر والد بڑے ہراساں تھے۔

جب صفائی کی گواہیاں ختم ہوئی تھیں تو میں نے اپنا تحریری بیان داخل کیا تھا اس کو پڑھ کر مجھے اچھی طرح یاد ہے مجسٹریٹ صاحب نے فرمایا تھا: "بیان ہی ملزم کو سزا دینے کے لیے کافی ہے۔"

یہ بیان حسب ذیل ہے:

میں افسانہ "ٹھنڈا گوشت" مطبوعہ ماہنامہ "جاوید" لاہور کا مصنف ہوں جو استغاثے کے نزدیک عریاں اور فحش ہے۔ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ یہ افسانہ کسی بھی نکتۂ نظر

سے ایسا نہیں ہے۔

فحاشی کے متعلق بہت کچھ کہا جا چکا ہے اور کہا جا سکتا ہے مگر یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ "ادب" ہرگز ہرگز فحش نہیں ہو سکتا۔ افسانہ "ٹھنڈا گوشت" کو اگر ادب کے دائرے سے باہر کر دیا جائے تو اس کے فحش ہونے یا نہ ہونے کا سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ مگر یہ افسانہ ایک ادیب کی تصنیف ہے جو ادبِ جدید میں کافی اہمیت رکھتا ہے اس کا ثبوت اس کی تصانیف ہیں اور وہ مضامین ہیں جو قریب ہر ادبی رسالے میں اس کے فن پر شائع ہوئے ہیں۔

اس سے پہلے تین مرتبہ چند افسانوں کے بارے میں شبہ ہوا تھا کہ وہ فحش ہیں۔ چنانچہ مجھ پر مقدمے چلے۔ سزائیں ہوئیں لیکن اپیل کرنے پر ہر بار سیشن کورٹ میں مجھے اور میرے افسانوں کو فحاشی کے الزام سے بری کیا گیا۔

میرے ایک مقدمے کے سلسلے میں مسٹر ایم۔ آر بھاٹیہ اڈیشنل سیشن جج کے فیصلے کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں۔

"قابلِ غور امر ہے کہ ایسے اشخاص ملزموں کی صفائی میں پیش ہوئے ہیں۔ جو اردو زبان کے عالم ہونے کی حیثیت میں بہت مشہور ہیں مثال کے طور پر خان بہادر عبدالرحمن چغتائی، مسٹر کے ایل کپور پروفیسر ڈی اے وی کالج۔ راجندر سنگھ بیدی اور ڈاکٹر آئی لطیف پروفیسر ایف سی کالج جو بطور گواہان پیش ہوئے۔ ان سب کی رائے ہے کہ مضمون زیں میں ایسی کوئی چیز نہیں جو جنسیاتی حیات پیدا کرے بلکہ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ مضمون ترقی پسند ہے اور اردو ادب کے ماڈرن رجحان سے تعلق رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ استغاثے کے گواہ محمد چراغ نے بھی دورانِ جرح یہ تسلیم کیا کہ مضمون انسان کے اخلاق پر برا اثر نہیں ڈالتا۔

ماتحت عدالتِ فاضلہ نے ہندوستانی نوجوانوں کی تعیش پسند زندگی کا ذکر کرتے ہوئے افسوس کیا ہے اور اس بات پر ماتم کیا ہے کہ ملک میں ہندوستانیوں کا پرانا کیریکٹر نابود ہو رہا ہے (ماتحت عدالت کے فاضل جج نے وہ خوبیاں بھی یاد کرائی ہیں جن کے لیے ہم ہندوستانی کبھی مشہور تھے اور نصیحت کی ہے کہ نئے فیشنوں کو ختم کر دینا چاہیے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ماتحت عدالتِ فاضلہ کے خیالات ترقی پسند نہیں ہیں۔ ہمیں زمانے کے ساتھ ساتھ چلنا ہے جیسی چیز آپ واقعی مستحق ہے۔ آرٹ جہاں بھی ملے ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیے۔ آرٹ خواہ وہ تصویر کی صورت میں ہو یا مجسمے کی شکل میں۔ سوسائٹی کے لیے قطعی طور پر ایک پیش کش ہے۔ چاہے اس کا موضوع غیر مستور ہی کیوں نہ ہو یہی کلیہ تحریروں پر بھی منطبق ہوتا ہے۔

جب ملک کے مشہور و معروف آرٹسٹوں اور ادیبوں نے ملزمین کے حق میں کہا ہے۔ سارا فیصلہ یہیں ہو جاتا ہے۔ زیرِ بحث مضمون ایسا نہیں کہ جس پر کسی قانونی عدالت میں نکتہ چینی کی جائے اس لیے مجھے اپیل منظور کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں۔ جرمانہ اگر ادا کیا گیا ہے تو واپس کیا جائے۔ میں اپیل کرنے والوں کو بری کرتا ہوں۔"

اس فیصلے سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ آرٹ فحش نہیں ہو سکتا ہے اور کسی فن پارے پر کسی قانونی عدالت میں نکتہ چینی نہیں کی جانی چاہیے۔

کوئی لٹریری پیس یعنی ادب پارہ معیاری یا غیر معیاری ہو سکتا ہے اس لیے کہ آرٹسٹ ہو سکتا ہے اپنا معیار قائم نہ رکھ سکے۔ افسانہ نگار کا ہر افسانہ اس کا شاہکار نہیں ہو سکتا۔

"ٹھنڈا گوشت" کے اسٹینڈرڈ کے بارے میں کہا نہیں جا سکتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ افسانہ میرے دوسرے افسانوں کے پائے کا نہیں۔ یہ کام ادبی نقادوں کا ہے اور انہیں اس بات کا حق ہے کہ وہ جانچیں پرکھیں۔ مگر اس افسانے پر کسی صورت میں بھی فحاشی کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ اس لیے کہ مصنف کی طرف سے افسانوی ادب میں اچھا برا جیسا بھی ہے یہ ایک افسانہ ہے۔ لیکن اس صورت میں کہ مجھے اپنی پوزیشن صاف کرنا ہے۔ آئیے ہم اس افسانے کو اچھی طرح جانچیں کہ اس میں فحاشی کا کوئی پہلو نکلتا ہے یا نہیں۔

افسانہ "ٹھنڈا گوشت" جیسا کہ ظاہر ہے ایک افسانہ ہے جس کا عقبی منظر یوں تو گزشتہ فسادات ہیں۔ لیکن دراصل جس کی بنیاد انسانی نفسیات پر قائم ہے اور انسانی نفسیات کا "جنس" سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔

افسانے میں دو کردار ہیں۔ ایشر سنگھ اور کلونت کور۔ دونوں ٹھیٹ قسم کے گنوار سکھ ہیں۔ جب کلونت کور محسوس کرتی ہے کہ ایشر سنگھ تبدیل ہو گیا ہے۔ اس کی پیار میں پہلی سی بات نہیں رہی۔ وہ اس سے بے رخی برت رہا ہے۔ کسی اور عورت سے اس نے ناطہ جوڑ لیا ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ سردار ایشر سنگھ ایک زبردست نفسیاتی ردِ عمل کا شکار رہتا۔ وہ لوٹ مار کے دوران میں قتل و غارت کرنے کے بعد ایک نوجوان مسلم دوشیزہ اٹھا لایا تھا۔ مگر جب اس نے دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ لڑکی دہشت کے مارے اس کے کندھوں پر ہی مر چکی تھی۔ اور اس کے سامنے ایک ٹھنڈی لاش پڑی تھی۔ ٹھنڈے گوشت کا لوتھڑا۔ اس کا ایشر سنگھ کو کچھ ایسا زبردست احساس ہوا کہ نفسیاتی طور پر بیکار ہو گیا۔

یہ بات یہاں قابلِ غور ہے کہ قتل و غارت نے اور لوٹ مار نے ایشر سنگھ پر کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ اس نے کئی انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا

مگر اس کے ضمیر پر احساس کی ایک ہلکی سی خراش بھی نہ آئی تھی۔ لیکن جب اس نے لڑکی کی ٹھنڈی لاش کو دیکھا تو اس واقعہ نے اسے بدل کر رکھ دیا۔

افسانہ "ٹھنڈا گوشت" کے متن میں جو کچھ بھی ہے ظاہر ہے کہ فحش نہیں۔ عنوان ہی ایک بیّن ثبوت ہے۔

ایشر سنگھ کا اندازِ گفتگو اس کا اپنا ہے۔ ہزاروں آدمی عام روزمرہ کی زندگی میں وہ الفاظ استعمال کرتے ہیں جو مصنف نے اس کے منہ سے کہلوائے ہیں۔ اس کی حرکات غیر فطری نہیں۔ اسی طرح کلونت کور کے متعلق کہا جا سکتا ہے۔

استغاثے کے فاضل وکیل نے خاص طور پر اس بات پر زور دیا ہے کہ ایشر سنگھ کے مکالموں میں گالیاں استعمال کی گئی ہیں۔ میں یہاں گالی کی نفسیات پر بحث نہیں کروں گا۔ مگر یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ وہ الفاظ جو استغاثے کے وکیل کے نزدیک گالی ہیں اصل میں گالی نہیں ہیں۔

"سالا" ہمارے یہاں بہت بڑی گالی متصور کی جاتی ہے لیکن بمبئی میں لفظ "سالا" کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ عام گفتگو میں آپ کو وہاں ایسے کئی فقرے سننے میں آئیں گے۔

"تمہارا باپ سالا بڑا اچھا آدمی تھا۔"

"سالا ہم سے مِسٹیک ہو گیا۔"

"سالا کیسی بات کرتا ہے۔"

ماں بہن کی گالی یوپی اور پنجاب میں گفتگو میں عام استعمال ہوتی ہے اور کسی کے کان کھڑے نہیں ہوتے۔ خاص گالی اکثر لوگوں کا تکیہ کلام بن جاتی ہے۔ ایشر سنگھ بھی چند گالیوں کو تکیہ کلام کے طور پر ہی استعمال کرتا ہے۔ اس لیے

استغاثے کے فاضل وکیل کا اس نکتے پر زور دینا بالکل بیکار ہے۔

اس کے علاوہ یہ اہم بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ ایشر سنگھ جیسے اجڈ اور گنوار آدمی سے شائستہ کلامی کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے اس کے منہ میں اگر مصنف نے مہذب اور شائستہ الفاظ ڈالے ہوتے تو افسانے میں حقیقت نگاری کا خاتمہ ہوجاتا بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ افسانہ ایک نہایت ہی بھونڈی شکل اختیار کرلیتا اور آرٹ کی سطح سے بہت ہی نیچے خرافات کے کھڈ میں گر جاتا۔

سوال ہے جو چیز جیسی ہے اسے من و عن کیوں نہ پیش کیا جائے۔ ٹاٹ کو اطلس کیوں بنایا جائے۔ غلاظت کے ڈھیر کو عود و عنبر کے انبار میں کیوں تبدیل کیا جائے۔ حقیقت سے انحراف کیا ہمیں بہتر انسان بننے میں ممد و معاون ہوسکتا ہے — ہرگز نہیں — پھر ایشر سنگھ کے کردار اور اس کی گفتار پر اعتراض کیا معنی رکھتا ہے۔

ایشر سنگھ گندہ ذہن سہی۔ افسانے کا موضوع گھناؤنا سہی۔ لیکن کیا اس کو پڑھنے کے بعد ہمیں انسانیت کی وہ رمق دکھائی نہیں دیتی جو ایشر سنگھ کے سیاہ قلب میں خود اس کا مکروہ فعل پیدا کرتا ہے اور یہ ایک صحت مند چیز ہے کہ اس افسانے کا مصنف انسانوں اور انسانیت سے مایوس نہیں ہوا۔ اگر مصنف نے ایشر سنگھ کے دل و دماغ پر نفسیاتی ردِ عمل پیدا نہ کیا ہوتا تو یقیناً "ٹھنڈا گوشت" ایک نہایت ہی مہمل چیز ہوتی۔

مجھے افسوس ہے کہ وہ تحریر جو انسانوں کو بتاتی ہے کہ وہ انسان سے حیوان بن کر بھی انسانیت سے علیحدہ نہیں ہوسکتے فحش اور جذبات کو ابھارنے والی سمجھی جارہی ہے۔ اور یہ لطیفہ ہے کہ افسانے میں ایک انسان کو اس کی رہی

سہی انسانیت ایک بہت بڑی سزا دیتی ہے۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ ایشر سنگھ کو اپنی چری ہوئی گردن کا بالکل احساس نہیں تھا۔ اس کو آخری سانس تک صرف ایک ہی بات ستاتی رہی۔ کہ وہ ایک ٹھنڈی لاش کو اٹھا لایا تھا۔

فرانس میں مشہور ناول نگار فلابیر کی تصنیف "مادام بوواری" پر فحاشی کے الزام میں مقدمہ چلا تو وکیل صفائی موسیو سینار نے فاضلانہ بحث کے دوران میں کہا۔

> "حضرات! یہ کتاب جو بقول وکیل استغاثہ جذبات کو بھڑکاتی ہے موسیو فلابیر کے وسیع مطالعے اور غور و فکر کا نتیجہ ہے اس نے اپنی توجہ متین فطرت کی وساطت سے ایسے ہی متین اور مغموم مضامین کی طرف منعطف کی ہے۔ وہ ایسا آدمی نہیں جس کے خلاف وکیل استغاثہ نے ہیجان خیز تصویروں کی نقاشی کے الزام میں جگہ جگہ اپنی تقریر میں زہر اگلا ہے۔ میں پھر دہراتا ہوں کہ فلابیر کی فطرت میں بے انتہا سنگینی شدید سنجیدگی اور بے پناہ ملال بھرا پڑا ہے۔"

میں اپنے متعلق صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں ایک شریف خاندان کا فرد ہوں۔ اتفاق سے میرا پیشہ تصنیف و تالیف ہے۔ اپنی فطرت اور جو تعلیم و تربیت مجھے ملی ہے اس کی بدولت میں نے آج تک سستا اور سوقیانہ ادب پیش نہیں کیا۔ اردو کے جدید ادب سے جو ذرا سا بھی واسطہ رکھتے ہیں ان کو میرے ادبی مقام کا علم ہے۔

افسانہ "ٹھنڈا گوشت" میں فلابیر کی فطرت کی بے انتہا سنگینی اور شدید سنجیدگی شاید نہ ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ بے پناہ ملال سے بھرا پڑا ہے اور

جب سوال فلاں کا ہو تو فحاشی کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔

اب افسانے کو اس پہلو سے بھی دیکھا جائے کہ مصنف کی نیت کیا ہے۔ رائے صاحب لالہ سنت رام کی عدالت میں اپنے افسانے "دھواں" کے سلسلہ میں صفائی کا بیان دیتے ہوئے میں نے کہا تھا۔

> تحریر، تقریر، شعر و شاعری، سنگ تراشی و صنم تراشی میں فحاشی تلاش کرنے کے لئے سب سے پہلے اس کی ترغیب ٹٹولنی چاہیے اگر یہ ترغیب موجود ہے۔ اگر اس کا ایک شائبہ بھی نظر آ رہا ہے تو وہ تحریر، وہ تقریر، وہ شعر، وہ بت قطعی طور فحش ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسی کوئی ترغیب زیر بحث افسانے میں نہیں ہے۔ میں افسانے کا تجزیہ اوپر کر چکا ہوں جو یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ مصنف کی نیت میں کوئی فرق نہیں تھا اور اس نے محض ایک نفسیاتی حقیقت کو اس کے صحیح روپ میں افسانے کی صورت میں پیش کیا ہے۔

افسانہ "ٹھنڈا گوشت" پڑھ کر اگر کسی صاحب کے جذبات برانگیختہ ہوں تو انہیں کسی ذہنی معالج سے رجوع کرنا چاہیے۔ افسانہ "دھواں" ہی کی صفائی کے سلسلے میں میں نے اپنے بیان میں کہا تھا۔

> "ایک مریض جسم، ایک بیمار ذہن ہی ایسا غلط اثر لے سکتا ہے۔ جو لوگ روحانی، ذہنی اور جسمانی لحاظ سے تندرست ہیں۔ اصل میں انہیں کے لئے شاعر شعر کہتا ہے۔ افسانہ نگار افسانہ لکھتا ہے اور مصور تصویر بناتا ہے۔

میرے افسانے تندرست اور صحت مند لوگوں کے لئے ہیں۔ نارمل

انسانوں کے لئے۔ جو عورت اور مرد کے رشتے کو حیرت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ بلکہ اس کی صحیح قدروں کو پہچانتے ہیں۔"

افسانہ "ٹھنڈا گوشت" بھی دوسرے ادب پاروں کی طرح صحت مند دماغوں کے لئے ہے۔ ایسے دماغوں کے لئے نہیں ہے جو معصوم اور پاکیزہ چیزوں میں بھی برائی کرید لیتے ہیں۔

دنیا میں تو ایسے اشخاص بھی موجود ہیں جو مقدس کتابوں میں بھی برائیوں کو ڈھونڈ لیتے ہیں۔ مگر ایسے لوگوں کا علاج ہونا چاہیے۔

امریکہ میں مشہور مصنف جیمز جوئس کی تصنیف "یولی سیز" کو فحاشی سے بری کرتے ہوئے جج وولزے نے اپنے فیصلے میں لکھا۔

> ایک خاص کتاب ایسے جذبات اور خیالات پیدا کر سکتی ہے یا نہیں۔ اس کا فیصلہ عدالت کی رائے کے ذریعہ دیکھ کر ہوگا کہ اوسط درجے کے جنسی جبلتیں رکھنے والے آدمی پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ ایسے آدمی پر جسے فرانسیسی "معمولی قسم کی حسیات رکھنے والا انسان" کہتے ہیں اور جس کی حیثیت قانون تفتیش کی اس شاخ میں ایک فرضی عامل کی ہوتی ہے۔ جیسے عدالت خفیفہ کے مقدموں میں "سمجھ بوجھ والے آدمی" کی حیثیت ہوتی ہے۔ یا جیسی کہ قانون میں ایجاد کے مسئلے کے متعلق "فن کے ماہر" کی۔

قانون کا تعلق صرف اوسط درجے کے آدمی سے ہے۔ چنانچہ افسانہ "ٹھنڈا گوشت" کے متعلق کوئی فیصلہ مرتب کرنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کے مطالعے سے ایک اوسط درجے کی جنسی جبلتیں رکھنے والے آدمی کے دل و دماغ پر کیا اثر ہوتا ہے۔

مشہور امریکی ناول نگار ارسکائن کیلڈ ول کی تصنیف "گوڈز لٹل ایکر" کو فحاشی کے الزام سے بری کرتے ہوئے عدالت نے اپنے فیصلے میں لکھا۔

"مصنف کا مقصد ایک سچی تصویر پینٹ کرنا تھا۔ ایسی تصویروں میں بعض ضروری تفصیلوں کا آجانا لابدی امر ہے اور چونکہ ایسی تفصیلوں کا گہرا تعلق زندگی کے جنسی پہلو سے ہوتا ہے۔ اس لیئے انہیں بیہمانہ صاف گوئی کے ساتھ بیان کر دیا جاتا ہے۔ اس لیئے عدالت یہ حکم صادر نہیں کر سکتی کہ ایسی تصویریں سرے سے بنائی ہی نہ جائیں ــــ کرداروں کی زبان بلاشبہ بھدی اور گندی ہے۔ مگر عدالت مصنف سے ان پڑھ اور غیر مہذب لوگوں کے منہ میں شائستہ زبان ڈال دینے کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتی۔"

افسانہ "ٹھنڈا گوشت" ایک سچی تصویر ہے۔ اس میں کوئی ابہام نہیں بڑی ہی بیہمانہ صاف گوئی سے اس میں ایک نفسیاتی حقیقت کی نقاب کشائی کی گئی ہے اگر اس میں کہیں گندگی اور غلاظت ہے تو اسے مصنف کے ساتھ نہیں بلکہ افسانے کے کرداروں کی ذہنی سطح کے ساتھ منسوب کرنا چاہیئے۔

کسی تحریر کے چند الفاظ اگر چٹخے سے اٹھا کر لوگوں کو دکھائے جائیں تو فحش ہیں تو اس سے کوئی صحیح اندازہ نہیں ہوگا ــــ ان الفاظ کی جداگانہ اشاعت قابلِ گرفت ہو سکتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے غالب۔ میر۔ ارسٹوفینز۔ چاسر۔ بوکیو۔ بلکہ کتاب مقدس تک کے بعض مقامات کو قابلِ تعزیر گردانا جا سکتا ہے۔ تاہم کسی تحریر کو سمجھنے کے لیئے اسے مجموعی طور ہی سے دیکھنا پڑے گا۔

مجھے آخر میں یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ مجھے انتہائی افسوس ہے کہ استغاثے کی طرف سے میری تصنیف "ٹھنڈا گوشت" پر کوئی ادبی تنقید نہیں ہوئی اگر ایسا

ہوتا تو مجھے دلی مسرت ہوتی۔ افسانے میں اگر کوئی فنی کمزوری رہ گئی تھی۔ بیان میں اگر کوئی سقم تھا۔ انشا میں اگر کوئی خامی تھی تو مجھے اس کا علم ہو جاتا اور میں کچھ حاصل کرتا لیکن میں پہلی ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا ہوں اور ایک نہایت ہی گھناؤنے الزام کا منہ دیکھ رہا ہوں۔ کہ میں نے اپنی تصنیف کے ذریعہ سے لوگوں کے جذبات ابھارے ہیں ــــ اس کے خلاف میرے دل سے احتجاج کے سوا اور کیا چیز نکل سکتی ہے ــــ حیرت ہے کہ "ٹھنڈا گوشت" پڑھ کر قاری کا ذہن خوف و نفرت میں ملفوف ہونے کے بجائے پراگندہ بھی ہو سکتا ہے۔

اور بھی حیرت ہے کہ ایشر سنگھ کو جو ہولناک سزا ملی وہ پڑھنے والے کے دل و دماغ میں گندے جذبات کیسے بیدار کر سکتی ہے۔"

سولہ جنوری آن پہنچی۔ شیخ سلیم بہت پریشان تھا۔ اس پریشانی کے باعث اس نے زیادہ پینا شروع کر دی۔ نصیر انور حسبِ معمول بے پروا تھا۔ عزیزی عارف عبدالمتین کا حلق پہلے سے زیادہ خشک ہو گیا تھا۔

سولہ جنوری کی صبح کو پانچ سو روپے جیب میں ڈال کر میں ضلع کچہری روانہ ہوا۔ شیخ سلیم پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ صبح سے پی رہا تھا۔ بوتل پتلون کی جیب میں تھی۔ خود بہت مضطرب تھا۔ لیکن بار بار مجھے تسلی دیتا تھا "بھائی جان فکر کی کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں یہ سن کر مسکرا دیتا۔

اتنے میں نصیر انور اور عارف عبدالمتین بھی آ گئے۔ عارف نے مجھ سے بڑے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا "منٹو صاحب۔ آپ کا کیا خیال ہے کیا ہوگا۔" میں نے جواب دیا "وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔"

مجسٹریٹ صاحب آ چکے تھے مگر فیصلہ سنانے کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ گیارہ بج گئے۔ بارہ بج گئے۔ پانی پی پی کر ہمارے پیٹ اپھر گئے۔

گر آواز نہ پڑی۔ اتنے میں میرے ایک مخبر نے مجھے بتایا کہ فیصلہ تیار ہے۔ مگر میاں اسلم، اسیم سعید اس میں شاید کچھ ترمیم کرنا چاہتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد پتہ چلا کہ میاں صاحب غائب ہیں۔ یعنی اپنے کمرے میں موجود نہیں۔ اور یہ کہ انہوں نے صبح سے کسی مقدمے کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔

ایک صاحب نے یہ کہا کہ وہ بہت پریشان ہیں۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ تھوڑی دیر کے بعد مخبر پھر خبر لایا۔ ایک طرف لے جا کر اُس نے مجھ سے سرگوشی میں کہا "میں فیصلہ دیکھ آیا ہوں — جلدی جلدی میں دیکھا ہے۔ صرف چند آخری سطریں۔ آپ کو یقیناً سزا ہوگی۔ اور جرمانہ بھی — آپ کے نام کے آگے یہ لکھا تھا: — And Santence him to undergo—
اس کے آگے جگہ خالی تھی۔ دوسرے ملزموں کو صرف جرمانہ ہوا۔ میں جاتا ہوں اور ضامن کا بندوبست کرتا ہوں۔"

میں سوچنے لگا۔ سزا کتنی ہوگی۔ ایک ماہ کی۔ دو ماہ کی یا چند دنوں کی؟ میں نے کسی سے بات نہ کی البتہ شیخ خورشید صاحب کو سب کچھ بتا دیا۔ آپ نے فوراً ضمانت کے کاغذ تیار کر لیے اور مجھ سے کہا "گھبرائیے نہیں منٹو صاحب۔ سزا زیادہ سے زیادہ دس بارہ یوم کی ہوگی۔" لیکن پھر کچھ سوچ کر تشویشناک لہجے میں کہا "لیکن ایسا نہ ہو وہ ضمانت لینے سے انکار کر دے۔"

یہ سن کر مجھے بہت تشویش ہوئی۔ کیونکہ مجسٹریٹ صاحب کا رویہ شروع ہی سے مخاصمانہ رہا تھا۔ لیکن کچھ کہا بھی تو نہیں جا سکتا تھا۔ خاموش دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ اور میں نے شیخ سلیم کو ساری بات بتا دی۔ میرے جی کا بوجھ تو کسی قدر ہلکا ہوگا۔ مگر شیخ بے چارہ اور زیادہ مضطرب ہو گیا۔ لیکن تسلی دینے کی خاطر مجھ سے کہا "کچھ فکر نہ کرو بھائی جان

— میں ٹیکسی لے کر وہاں جیل میں پہنچوں گا — روپیہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں ایسے معاملے نپٹانا جانتا ہوں — میرا خیال ہے آپ اس وقت ایک بڑا پیگ لگا لیجیے۔"

میں نے کہا "نہیں شیخ صاحب — شام کو۔"

شیخ صاحب نے کہا "تو آپ مطمئن رہیں، میں آپ کو وہاں پہنچا دوں گا۔"

یہ سن کر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی — ایک بج چکا تھا۔ شیخ سلیم، نصیر انور اور میں نے گورنمنٹ کالج کے ہوسٹل کے سامنے گھاس کے میدان پر بیٹھ کر "آلو چھولے" کھائے اور اس خیال سے کہ کہیں آواز نہ پڑ جائے جلدی لوٹ آئے اور فیصلے کا انتظار کرنے لگے۔

نصیر انور اور عارف عبدالمتین سے میں نے اشارتاً کئی بار کہہ دیا تھا کہ وہ جرمانے کا بندوبست کر لیں تاکہ عین وقت پر پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ شیخ سلیم پی پی کر اسکیمیں سوچ رہا تھا کہ وہ جیل میں مجھ تک کیسے پہنچے گا اور میری آسائش کا بندوبست کن ذرائع سے کرے گا۔

عزیزی مشتاق احمد اپنے ایک دولتمند دوست شریف صاحب کو میری ضمانت دینے کے لیے پکڑ لائے تھے۔ یہ غریب بھی ہماری طرح کھڑے کھڑے بور ہو رہے تھے۔ شیخ سلیم کو غصہ تھا کہ جب وہ موجود ہے تو کوئی اور ضمانت دینے کے لیے کیوں لایا گیا۔ میں نے اُن سے کہا "شیخ اگر آپ کو ضمانت دینے ہی کا شوق ہے تو دو ملزم اور موجود ہیں۔" شیخ صاحب اس وقت اچھے موڈ میں تھے۔ میری یہ بات سن کر مسکرا دیئے اور ایک پیگ چڑھا کر اسکیمیں سوچنے میں محو ہو گئے۔ ان کو اس بات کی بہت فکر تھی کہ منٹو کی شام خراب ہو جائے گی۔

پانچ بج گئے۔ تشویش اور تردد بڑھتا گیا۔ نصیر بالکل بے پرواہ تھا۔ جیسے کچھ

ہونے والا نہیں۔ اس کی یہ بے پروائی قابلِ رشک تھی۔ عارف عبدالمتین کا حلق اب اتنا خشک ہو چکا تھا کہ اس نے بولنا بند کر دیا تھا ـــ ساڑھے پانچ ہوئے تو ہمیں بلایا گیا۔ فوراً شیخ خورشید صاحب کو اطلاع دی گئی۔ وہ بھاگے بھاگے آئے ہم سب حاضرِ عدالت ہوئے۔

میاں اے۔ ایم سعید دانتوں تلے قلم دبائے۔ سامنے میز پر فیصلے کے کاغذ رکھے سوچ میں غرق بیٹھے تھے۔ شیخ خورشید کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بے حد مضطرب ہیں۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ شیخ سلیم کا رنگ زرد تھا۔ عارف عبدالمتین بار بار ہونٹوں پر خشک زبان پھیر رہا تھا ـــ نصیر انور اسی طرح بے پروا تھا۔

پریس رپورٹر موجود تھے۔ کاغذ پنسل ہاتھ میں لیے وہ بڑی بے چینی سے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ چند لمحات مکمل سکوت طاری رہا۔ اس کے بعد میاں اے۔ ایم سعید صاحب کھنکارے۔ دانتوں کی گرفت سے قلم آزاد کیا۔ نبکو روشنائی دکھائی۔ فیصلے کے کاغذ الٹ پلٹ کیے اور بہت سوچ سوچ کر ایک کاغذ پر خالی جگہیں پُر کیں۔ اس کے بعد میرے بارے میں اپنا فیصلہ صادر فرمایا ـــ تین مہینے قیدِ بامشقت اور تین سو روپے جرمانہ ـــ عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں اکیس یوم مزید قیدِ بامشقت۔ شیخ سلیم کا رنگ اور زیادہ زرد ہو گیا۔ اُس نے نگاہوں ہی نگاہوں میں مجھے تسلی دی گویا یہ کہہ رہا ہے "کچھ فکر نہ کرو۔ میں وہاں جیل میں ضرور پہنچوں گا"۔

میں یہ سوچنے لگا تھا کہ مجسٹریٹ ضمانت قبول کرے گا یا نہیں۔ تھوڑے وقفے کے بعد میاں اے۔ ایم سعید نے دوسری خالی جگہیں پُر کیں اور بقایا دو ملزمین کے بارے میں فیصلہ سنایا ـــ تین تین سو روپیہ جرمانہ ـــ عدم ادائیگی

جرمانہ کی صورت میں اکیس یوم قیدِ بامشقت

میں نے جرمانہ داخل کر دیا۔ شیخ خورشید صاحب نے میری ضمانت کے کاغذ پیش کیے تو میاں اے۔ ایم سعید نے کہا: "میں اگر ضمانت منظور کرتا ہوں تو سزا کا مطلب ہی فوت ہو جاتا ہے"۔

شیخ خورشید صاحب نے یہ استدلال پیش کیا: "آپ کا ارشاد درست ہے ملزم نے جرمانہ ادا کر دیا ہے۔ جو اپیل منظور ہونے کی صورت میں یقیناً واپس مل جائے گا۔ لیکن وہ دو تین دن جو ضمانت ہونے سے پہلے میرا موکل جیل میں کاٹے گا۔ اپیل منظور ہونے پر کیا اُسے واپس مل جائیں گے"۔

استدلال بہت معقول تھا مگر پھر بھی میاں اے۔ ایم سعید کچھ دیر اڑے رہے آخر میں کرم فرمائی کی اور میری ضمانت قبول کر لی۔

عارف عبدالمتین کے والد صاحب نے اُن کا جرمانہ ادا کر دیا۔ اب رہ گئے نصیر انور ان سے پوچھا گیا تو انھوں نے بڑی بے پروائی سے کہا: "میرے پاس تو فی الحال کچھ بھی نہیں ہے"۔ مجسٹریٹ صاحب نے حکم دیا کہ ہتکڑی لگاؤ اور جیل بھیج دو۔ نصیر انور اسی طرح خاموش کھڑا رہا۔ میرے دو سو روپے موجود تھے۔ چودھری نذیر مالک نیا ادارہ سے میں نے کہا کہ ایک سو روپے کا بندوبست کر دیں۔ مگر ان سے نہ ہو سکا۔ سپاہی ہتھکڑیاں لیے نصیر کی پیٹھ پیچھے کھڑا تھا۔ ان کی جھنکار عدالت کے کمرے میں گونج رہی تھی۔ باہر پولیس وین تھی۔ یعنی سارے لوازمات موجود تھے۔

آخر خورشید صاحب ہی کام آئے۔ آپ نے میاں اے۔ ایم سعید صاحب سے بڑے مناسب و موزوں الفاظ میں درخواست کی کہ وہ نصیر انور کی ضمانت لے لیں۔ جرمانے کا روپیہ وہ کل صبح داخل کر دیں گے۔ مجسٹریٹ صاحب نے

یہ درخواست قبول کرلی۔ اب ضامن کا سوال تھا۔ شیخ خورشید صاحب نے پوچھا: "ان کی ضمانت کون دے گا؟"

کوئی آگے نہ بڑھا۔ اچانک شیخ سلیم نے جو اب تک نشے میں دھت ہو چکے تھے شیخ خورشید صاحب سے مخمور لہجے میں کہا: "نصیر صاحب کی ضمانت میں دیتا ہوں"۔۔۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ اگر عدالت کو معلوم ہو گیا کہ شیخ صاحب پیے ہوئے ہیں تو ان کی ضمانت کون دے گا۔۔۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور دھر لیے جائیں گے اور سارا معاملہ چوپٹ ہو جائے گا۔۔۔ میں اسی خوف کے مارے کمرے سے باہر چلا گیا۔ بار بار اندر جھانک کر دیکھتا کہ شیخ سلیم گرفتار ہوئے ہیں یا نہیں۔ لیکن خیریت گذری۔ نصیر انور کی ضمانت ہو گئی ۔۔۔ شیخ صاحب جھومتے ہوئے باہر نکلے اور مجھے گلے لگا کر رونے لگے: "اللہ میاں نے میرے بھائی کو بچا لیا۔" یہ کہہ کر آپ نے جیب سے بوتل نکال کر ایک گھونٹ بھرا جو کہ آخری تھا: "چلو بھئی چلیں۔ کہیں دوکان بند نہ ہو جائے۔"

نصیر انور بہت ممنون و متشکر تھا۔ بار بار شیخ سلیم کا شکریہ ادا کرتا تھا۔ شیخ صاحب نے اس سے کہا: "شکریہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ آپ میرے دوست کے دوست ہیں۔"

اب سیشن میں اپیل دائر کرنے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ میاں اے۔ ایم سعید کے فیصلے کی نقل حاصل کرنے کے لئے درخواست دی جب نہ ملی تو درخواست کے ساتھ نو "پہیّے" لگائے۔ نقل مل گئی۔

میاں صاحب کا فیصلہ انگریزی میں تھا۔ ذیل میں اس کا انگریزی اردو ترجمہ درج ہے۔

فیصلہ

ایک اردو رسالہ بہ نام "جاوید" کے ایڈیٹر عارف عبدالمتین اور اس کے پبلشر نصیر انور کو معہ ایک مصنف مسمی سعادت حسن منٹو کے میرے پاس مقدمہ زیر دفعہ ۲۹۲ پی۔پی۔سی کے لئے بھیجا گیا ہے۔ مؤخر الذکر ملزم کے خلاف یہ الزام ہے کہ وہ ایک فحش کہانی جس کا عنوان "ٹھنڈا گوشت" ہے کا مصنف ہے اور جو مذکورہ بالا رسالہ کے ایک خاص نمبر میں شائع ہوئی ہے۔ دوسرے دو ملزموں کے خلاف یہ الزام ہے کہ انہوں نے اس کہانی کو مندرجہ بالا انداز میں شائع کرنے کا جرم کیا ہے۔

رسالہ "جاوید" کا خاص نمبر مارچ ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ سید ضیاء الدین مترجم پریس برانچ حکومت پنجاب کے علم میں آیا جو اس مقدمہ میں گواہ استغاثہ ۳ کی حیثیت سے پیش ہوا ہے۔ اس کا یہ فرض ہے کہ وہ کسی بھی طبع شدہ چیز میں کوئی فحش مواد محسوس کرے تو اس سے حکومت پنجاب کو مطلع کرے۔ اس کے خیال میں مذکورہ بالا ایڈیشن میں شائع شدہ کہانی بعنوان "ٹھنڈا گوشت" فحش تھی۔ چنانچہ اس نے حکومت پنجاب کی توجہ اس طرف مبذول کرائی اور اس غرض کے لیے قانونی کارروائی کے لیے کہا۔

اس کہانی کی تصنیف اور خاص نمبر میں اس کی اشاعت سے انکار نہیں کیا گیا۔ اور نہ پہلے دونوں ملزم رسالے کے مدیر اور ناشر ہونے سے منکر ہیں لہٰذا اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ کہانی "ٹھنڈا گوشت" فحش ہے یا نہیں۔

استغاثے نے مذکورہ رسالے کے خاص نمبر کو پیش کیا ہے جو ریکارڈ میں (EX-P-4) کی حیثیت سے درج کیا گیا ہے کہانی جو اس قانونی چارہ جوئی کا موضوع ہے اس شمارے کے صفحہ ۸۸ سے ۹۳ تک چھپی ہے۔ میں نے نہایت غور سے اس کہانی کو پڑھا جو موضوع کی تشکیل کرتی ہے اور دیکھا کہ اس میں گندہ طرز بیان اور ناشائستہ گالیاں استعمال کی گئی ہیں۔ میں نے یہ بھی

محسوس کیا۔ اس کہانی میں کئی مناظر ایسے ہیں جو حد درجہ کی فحاشی لیے ہوئے ہیں۔

یہ طے کرنے کے لیے کہ آیا کوئی تصنیف مثلاً زیر بحث کہانی فحش ہے یا نہیں، ضروری ہے کہ ایک معیار مقرر کیا جائے جس سے فحاشی کی تمیز کی جا سکے۔

۳ کیو۔ بی (۱۸۶۸ء) میں ہکلن رپورٹ میں اسی موضوع کے ایک مشہور مقدمے میں لارڈ کوک برن سی۔ جے صفحہ ۳۶۰ (یا صفحہ ۳۷۱) پر فحاشی کا یہ معیار مقرر کیا تھا اس قسم کا الزام زدہ مواد جو ان لوگوں کو بداخلاقی اور بدچلنی کی ترغیب دے جن کے اذہان اس قسم کے مخرب اخلاق اثرات قبول کر سکتے ہوں۔ اور جن کے ہاتھوں میں اس قسم کا مواد پہنچ سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی تمام عدالت ہائے عالیہ ہمیشہ اس معیار کی تقلید کرتی رہی ہیں۔ اس معیار سے یہ ظاہر ہے کہ قانون میں مستعملہ عریانی اس ماحول سے متعلق ہے جس میں کہ یہ جانچی جاتی ہے۔ وہ باتیں جو ایک پاکستانی کے اخلاق کے لیے ضرر رساں خیال کی جائیں۔ جہاں تک ایک فرانسیسی کا تعلق ہے، بالکل بے ضرر سمجھی جا سکتی ہیں۔ ہر سوسائٹی کے اپنے اخلاقی معیار ہوتے ہیں۔ اور وہ چیزیں جو ایک سوسائٹی کا اخلاقی قوام خیال کی جاتی ہیں۔ بعض اوقات اسی دوسری سوسائٹی کے معیار کے مطابق غیر اخلاقی ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح اظہار کے بعض اسالیب کا اثر مختلف سوسائٹیوں کے افراد پر مختلف ہوتا ہے خواہ یہ اظہار مخالف معیاروں کے نزدیک غیر اخلاقی ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے زیر بحث کہانی کے فحش یا غیر فحش ہونے کا فیصلہ پاکستان کے مروجہ اخلاقی معیاروں کے پس منظر پر کرنا ہوگا۔ اور اس اثر کے مطابق جو اس قسم کی تحریر اس سوسائٹی میں رہنے والے لوگوں کے اذہان پر ڈالے گی۔

لارڈ کوک برن کا قائم کردہ معیار ایک مکمل اور جامع تعریف نہیں ہے جیسا کہ اس کا مفہوم ظاہر کرتا ہے صرف ایک معیار ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور بھی معیار ہو سکتے ہیں ان میں سے ایک وہ رجحان ہے کہ یہ الزام زدہ مواد میں موجود ہے جو قارئین کے اخلاقی احساسات کو ٹھیس پہنچاتا ہے ـــ یہ معیار بھی قارئین کے اذواق پر منحصر ہے۔

استغاثہ نے ابتداء میں صرف پانچ گواہ پیش کیے اور اپنا کیس بند کر دیا۔ گواہ استغاثہ ۱ مسٹر محمد یعقوب منیجر کپور آرٹ پرنٹنگ پریس۔ ۲۔ شیخ محمد طفیل۔ ۴۔ مرزا محمد اسلم۔ گواہ استغاثہ ۵ خدا بخش نے ان امور کے متعلق شہادت دی جن کا فحاشی سے کوئی تعلق نہیں۔ گواہ استغاثہ ۳ سید ضیاء الدین نے دوسرے امور بیان کرنے کے علاوہ اپنی رائے ظاہر کی کہ زیر بحث کہانی فحش ہے تاہم ریکارڈ میں کوئی اس قسم کا مواد نہیں جن سے ظاہر ہو کہ یہ گواہ ماہر ادب سمجھا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں قانونِ شہادت کی دفعہ ۴۵ کی رو سے اس کی شہادت قابلِ قبول نہیں ہے۔ اس لیے جہاں تک فحاشی کے مسئلے کا تعلق ہے۔ استغاثے کا کیس جیسا کہ ابتداً پیش کیا گیا، خود عدالت کی رائے اور الزام زدہ مواد کے مطالعے کے بعد اس کی ماہیت پر منحصر ہوگا۔

ملزمین نے صفائی میں سات گواہ ادبی امور کے ماہرین کی حیثیت سے پیش کیے۔ ان گواہوں کی شہادت سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ زیر بحث تحریر فحش نہیں ہے۔ صفائی کے اختتام پر استغاثے نے درخواست کی کہ مسئلے کی اہمیت کے پیشِ نظر کچھ اور ماہرین بطور عدالتی گواہ بلائے جائیں اور میں نے انصاف کی خاطر چار اور ماہروں کو بطور عدالتی گواہ بلوایا۔

بیشتر ماہرین نے خواہ وہ صفائی کی طرف سے پیش ہوئے یا عدالت کی طرف سے

کسی نہ کسی فریق کے حق میں رائے دی کہ زیر بحث کہانی فحش ہے یا نہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے تعزیرات میں جو فحاشی کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے اس کی ٹیکنیکل اہمیت ہے جس کا تعین عدالت کو کرنا ہے۔ ماہرین کی شہادت اسی حد تک ضروری ہے جہاں تک یہ ادب کے مروجہ معیاروں، اظہار کی شائستگی [illegible] ہیں، اخلاقی یا غیر اخلاقی حیثیت اور اس رجحان کے متعلق جو کوئی تحریر قارئین کے اذہان پر اثر انداز ہو روشنی ڈالتی ہے۔ ان امور سے یہ تعین کرنا عدالت کا کام ہے کہ کوئی چیز فحاشی کی شرائط کو پورا کرتی ہے یا نہیں۔

صفائی کے گواہ ۱ مسٹر عابد علی عابد۔ ۲ مسٹر احمد سعید ۳ ڈاکٹر عبدالحکیم ۴ ڈاکٹر سعید اللہ ۵ شفیق احمد شفیق ۶ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم ۷ ڈاکٹر آئی لطیف سب صاحب علم ہیں۔ اُن کے خیال کے مطابق کیونکہ آرٹ زندگی کا آئینہ دار ہے اس لیئے فن کار کوئی ایسی چیز جو زندگی کی سچی تصویر ہو حقیقت پسندانہ طور پر پیش کر کے اپنے حقوق سے تجاوز نہیں کرتا۔ اس لیئے وہ یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ زندگی کا حقیقت پسندانہ اظہار فحش نہیں ہو سکتا۔ وہ زیر بحث کہانی کی غیر شائستہ زبان اور اس کے سوقیانہ محاوروں کو بھی قابل گرفت نہیں سمجھتے۔ کیونکہ یہ اس قسم کی گفتگو کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جو پیش کردہ کردار کے طرح کے لوگ بولتے ہیں۔ ان میں سے بعض نے یہ کہا ہے کہ زیر بحث کہانی میں قارئین کے اخلاق کو بگاڑنے کا کوئی میلان نہیں پایا جاتا۔ بعض نے اس نکتے پر خاموشی اختیار کی۔ عدالتی گواہ ۱ مولانا تاجور ۲ آغا شورش کاشمیری ۳ مولانا ابو سعید بزمی ۴ ڈاکٹر تاثیر بھی اُسی پائے کے علمی آدمی ہیں۔ ان گواہوں کی شہادت سے یہ بات بتایا گئی ہے کہ زیر بحث کہانی برا ادب ہے اور غیر شائستگی سے پیش کی گئی ہے۔

صفائی کے گواہ ۷ ڈاکٹر آئی لطیف نے رائے ظاہر کی کہ اگر زیر بحث کہانی کسی میڈیکل جریدے میں شائع ہوتی تو یہ ایک سبق آموز کیس ہسٹری ہوتی۔ لیکن ایک مقبول عام رسالے میں جسے ہر شخص پڑھ سکتا ہے، ناموزوں معلوم ہوتی ہے۔

صفائی کے گواہ ۸ کرنل فیض احمد فیض کا خیال ہے کہ اگرچہ وہ اسے فحش نہیں کہہ سکتے تاہم یہ کہانی ادب کا کوئی اچھا نمونہ نہیں۔ اس میں بعض غیر شائستہ محاورے استعمال کیئے گئے ہیں۔ جن سے اجتناب کیا جا سکتا تھا۔

عدالتی گواہ ۱ مولانا تاجور نے اس کی سخت اور غیر مبہم الفاظ میں مذمت کی۔ اور کہا کہ انھوں نے اپنے چالیس سالہ ادبی تجربے میں اس سے زیادہ کوئی چیز غیر شائستہ نہیں دیکھی۔ عدالتی گواہ ۴ ڈاکٹر تاثیر کی رائے ہے کہ اس میں ان لوگوں کا اخلاق بگاڑنے کا رجحان موجود ہے جو اخلاقی گراوٹ کا موجب بن سکتا ہے۔

پاکستان کے مروجہ اخلاقی معیار قرآن پاک کی تعلیم کے حوالے سے بہت صحیح طور پر معلوم ہو سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ غیر شائستگی اور شیطنت کی لگام شیطان کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ غیر شائستگی، نفس پرستی اور سوقیانہ پن زندگی میں موجود ہے اگر ادبی مذاق کے اس معیار کو تسلیم کر لیا جائے جسے صفائی کے گواہوں نے بیان کیا ہے تو زندگی کے پہلوؤں کا حقیقت نگارانہ اظہار اچھا ادب ہو سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ ہمارے معاشرے کے اخلاقی معیار کی خلاف ورزی کرے گا۔ ملزم سعادت حسن منٹو کی لکھی ہوئی کہانی ایک سوقیانہ آدمی کے کردار کو پیش کرتی ہے۔ ساری کہانی ایک ناشائستہ معاملے پر مرکوز ہے۔ درحقیقت ٹھنڈی اس کہانی کا بنیادی تصور ہے

ادبی اور نفسیاتی ماہر کہانی کا ایک خاص انداز سے ردِ عمل قبول کر سکتے ہیں۔ تاہم میری رائے میں ایک اکثر نابالغ پر اس قسم کی کہانی کا ردِ عمل اظہار بول چال اور خیالات میں غیر شائستگی کی حوصلہ افزائی کی صورت میں ہوگا۔

سعادت حسن منٹو جیسے بزعمِ خود مشہور مصنف کی مثال پیشِ نظر رکھتے ہوئے وہ نوجوان جو اس کہانی کو پڑھیں گے اسی طرح سے غیر شائستگی کو تقویت دیں گے۔

کہانی بعنوان "ٹھنڈا گوشت" کو غور سے پڑھنے کے بعد مجھے اطمینان ہو گیا ہے کہ اس میں قارئین کا اخلاق بگاڑنے کا میلان موجود ہے اور یہ ہمارے ملک کے مروجہ اخلاقی معیاروں کی خلاف ورزی کرتی ہے۔

اس لیے میں ملزم سعادت حسن منٹو کو ایک فحش تحریر پیش کرنے کا ذمہ دار ٹھیراتا ہوں اور اسے زیرِ دفعہ ۲۹۲ پی۔ پی۔ سی تین ماہ قید با مشقت اور تین سو روپے جرمانے کی سزا دیتا ہوں۔ عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں اس کو مزید ۲۱ یوم کی سزا بھگتنی پڑے گی۔

ملزمین عارف عبدالمتین اور نصیر انور جو واضح طور پر جریدے کے مدیر اور ناشر ہیں، جس میں مذکورہ کہانی شائع ہوئی ہے، ایک فحش تصنیف کی اشاعتِ عام کے مجرم ہیں اور وہ بھی اسی دفعہ کے تحت آتے ہیں۔ تاہم ان کے معاملے میں ان کی کم عمری کے پیشِ نظر اور بظاہر یہ کہ کہانی کا مصنف ایک ایسا شخص تھا جو خاصی اچھی شہرت کا مالک ہے انہوں نے اس اعتماد کی وجہ سے کہانی قبول کر لی ہوگی کہ یہ قابلِ قبول ادب پارہ ہوگا۔ میں ان ہر دو ملزموں کے لیے تین تین سو روپیہ جرمانے کی نرم سزا تجویز کرتا ہوں۔ چونکہ یہ انصاف کے تقاضوں کو پورا کریگی اس لیے میں اس کے مطابق حکم دیتا ہوں۔ عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں ملزمین عارف عبدالمتین اور نصیر انور کو اکیس یوم قید با مشقت بھگتنی پڑیگی۔

دستخط

ایس۔ ایم سعید مجسٹریٹ درجہ اوّل لاہور

۲۸ جنوری ۱۹۵۰ء کو سیشن میں اپیل دائر کر دی گئی۔ تاریخ ملنے پر ہم مہر الحق صاحب سیشن جج لاہور کی عدالت میں پیش ہوئے۔ آپ نے اس بنا پر کہ وہ مجھے اور میرے خاندان کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں اور ہم شہر (یعنی امرتسر) کے ہیں مقدمہ مسٹر جوشوا ایڈیشنل سیشن جج کی عدالت میں منتقل کر دیا۔ دوسری پیشی پر حاضر ہوئے تو معلوم ہوا کہ مسٹر جوشوا نے کیس واپس مہر الحق صاحب کو بھیج دیا ہے۔ یہ عذر ظاہر کر کے کہ وہ اردو زبان اچھی طرح نہیں جانتے۔ مہر الحق صاحب نے سوچ بچار کے بعد مقدمہ عنایت اللہ خاں صاحب ایڈیشنل سیشن جج کی عدالت کے سپرد کر دیا۔ ہم حاضر ہوئے تو عنایت اللہ خاں صاحب نے ہمارے وکیل سے فرمایا "یہ کیس چونکہ میرے لیے اپنی نوعیت کا پہلا کیس ہے۔ اس لیے میں اچھی طرح اسٹڈی کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے وقت درکار ہے۔ میں آپ کو ایک مہینے بعد کی تاریخ دیتا ہوں۔"

شیخ خورشید احمد نے کہا ٹھیک ہے۔ چنانچہ دلائل کے لیے جولائی کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ شیخ خورشید صاحب نے عدالت سے باہر آکر مجھ سے کہا "اچھا ہے اس دوران میں میں بھی خوب تیاری کر لوں گا۔" لیکن انھوں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ ہمارا کیس غلط آدمی کے پاس گیا ہے جو بڑا تنگ خیال ہے۔ داڑھی رکھتا ہے نماز روزے کا پابند ہے۔ میں نے کہا "ہٹائیے۔ یہاں نہیں تو ہائی کورٹ میں دیکھا جائے گا۔"

شیخ خورشید صاحب نے اس دوران میں اپنی رہبری کے لیے مجھ سے کہا کہ میں اپنے افسانے "ٹھنڈا گوشت" پر ایک مختصر سا تبصرہ لکھ دوں۔ چنانچہ میں نے انہیں ایک تبصرہ لکھ دیا۔

دس جولائی کا دن گرجتا ہوا آن پہنچا۔ مجھے سخت تشویش لاحق تھی۔ گھر میں سب

دعائیں مانگ رہے تھے کہ خدا خیر کرے۔ جج صاحب نے خاص کیس سمجھتے ہوئے چار گھنٹے بحث کے لیے وقف کر رکھے تھے مجھے ڈر تھا کہ میاں ایم سعید کی طرح کہیں عنایت اللہ خاں صاحب کا رویہ بھی مخاصمانہ نہ ہو۔ کیونکہ ضبط کرنا مرے لیے بہت مشکل ہے۔ میاں سعید صاحب کی عدالت میں کئی دفعہ ایسے موقعے آئے تھے کہ میں چھلک پڑوں مگر حیرت ہے میں نے کیسے ضبط کیا۔

ہم سب صبح حاضر عدالت ہوئے تو عنایت اللہ خاں صاحب نے اپنے دھیمے لہجے میں شیخ خورشید صاحب سے کہا: "معاف کیجیے۔ آپ کو آدھا گھنٹہ انتظار کرنا پڑے گا۔ میں ذرا یہ چھوٹے چھوٹے معاملے طے کر لوں۔"

ہم عدالت سے باہر نکل آئے۔ عارف عبدالمتین خاموش تھا۔ شیخ خورشید صاحب بھی خاموش تھے۔ اپنے ساتھ وہ موٹی موٹی قانونی کتابوں کا ایک ڈھیر اُٹھا کے لائے ہوئے تھے۔ ان کا دماغ شاید ان کے حوالوں میں گم تھا۔ میں ہائیکورٹ کی سوچ رہا تھا۔ نصیر انور چھدری گھاس پر رومال بچھا کر اُس پر بیٹھا غالباً کوئی کشمیری گیت گنگنا رہا تھا۔

پونے گھنٹے کے بعد ہمیں بلایا گیا۔ ہم عدالت کے کمرے میں داخل ہوئے جج صاحب کو سلام کیا ــــ عنایت اللہ خاں صاحب نے گردن کی ایک ہلکی سی جنبش سے اس کا جواب دیا۔ ہم ملزموں کے کٹہرے کی طرف بڑھنے لگے تو آپ نے اپنی دھیمی آواز میں کہا: "کرسیوں پر تشریف رکھیے۔"

میں سمجھا کہ شاید یہ کسی اور سے کہا گیا ہو مگر اُن کا رُوئے سخن ہماری طرف ہی تھا مجھے بڑا خوشگوار تعجب ہوا ــــ ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ نصیر انور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ بیحد مطمئن نظر آتا تھا۔

پیشتر اس کے کہ بحث شروع ہوتی جج صاحب بولے: "میں نے اس کیس کا

بغور مطالعہ کیا ہے۔ آپ حضرات مطمئن رہیں۔ کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ میں نے مثل میں سے صرف عدالت ماتحت کا فیصلہ پڑھا ہے۔ گواہیوں کا میں نے مطالعہ کرنا غیر ضروری سمجھا ہے۔ البتہ افسانہ "ٹھنڈا گوشت" بہت غور سے پڑھا ہے۔"

بحث شروع ہونے والی تھی کہ عنایت اللہ خاں صاحب نے استغاثے اور صفائی کے وکیلوں کی توجہ چند نکات کی طرف دلائی اور وضاحت چاہی۔ شیخ خورشید احمد خاموش رہے۔ ایک دو مرتبہ جج صاحب کی تائید میں البتہ کچھ ضرور کہا۔ پروسی کیوٹر صاحب کی تردید خود خان صاحب کر رہے تھے۔ قریباً آدھا گھنٹہ قانونی موشگافیاں کرنے کے بعد آپ نے مسکرا کر کہا: "میں سعادت حسن منٹو کو اگر سزا دوں تو وہ یہ کہیں گے کہ ایک داڑھی والے نے مجھے سزا دی۔"

ــــ اس کے بعد وہ کچھ دیر اور عدالت ماتحت کے فیصلے پر کچھ کہتے رہے۔ آخر میں ہم سے مخاطب ہوئے: "کیا آپ لوگوں نے جرمانہ ادا کر دیا تھا؟" ہم سب نے کہا: "جی ہاں۔" اس پر جج صاحب نے کہا: "آپ بری ہیں۔ جرمانہ آپ کو پورے کا پورا واپس مل جائے گا۔"

میں چند لمحات کچھ سوچ نہ سکا کہ کیا ہوا ہے۔ شیخ خورشید صاحب نے میرا شانہ پکڑ کر ہلایا اور کہا: "اُٹھیے حضرت۔ آپ بری ہیں۔"

عدالت سے باہر نکل کر جب میں نے چپڑاسیوں کو دس روپے انعام کے طور پر دیئے تو مجھے احساس ہوا کہ میں واقعی بری ہوں اور یہ کہ چوتھی مرتبہ میرا انجام بخیر و خوبی ہوا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا جس نے ایک بہت بڑی لعنت سے مجھے رہائی دلائی۔ شیخ خورشید صاحب اپنی کامیابی پر بہت خوش تھے اور بجا خوش تھے۔

عنایت اللہ خاں صاحب کے انگریزی زبان میں لکھے ہوئے فیصلے کا اردو ترجمہ یہ ہے

اپیل بخلاف حکم مسٹر اے ایم سعید مجسٹریٹ درجہ اوّل لاہور

مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۵۰ء

دعوے زیر دفعہ ۲۹۲ پی پی سی۔

سزا: عارف عبدالمتین تین سو روپیہ جرمانہ بصورت عدم ادائیگی تین ہفتہ قید بامشقت سعادت حسن منٹو کو تین ماہ قید بامشقت اور تین سو روپے جرمانہ بصورت عدم ادائیگی اکیس یوم قید بامشقت۔ نصیر انور تین سو روپیہ جرمانہ۔ بصورت عدم ادائیگی تین ہفتے قید بامشقت۔

فیصلہ

یہ تین نوجوانوں عارف عبدالمتین نصیر انور اور سعادت حسن منٹو کی طرف سے ایک اپیل ہے۔ اوّل الذکر دونوں ایک اردو رسالہ "جاوید" کے علی الترتیب مدیر اور ناشر ہیں۔ تیسرا ایک ادیب ہے جس نے مذکورہ رسالے کے مارچ ۱۹۴۹ء میں شائع شدہ ایک خاص نمبر میں اپنی ایک کہانی جس کا نام "ٹھنڈا گوشت" ہے چھپنے کے لیے دی۔

انہیں بحکم میاں اے۔ ایم۔ سعید مجسٹریٹ درجہ اوّل لاہور مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۵۰ء زیر دفعہ ۲۹۲ پی پی سی۔ (فحش کتابوں کی فروخت وغیرہ) کی خلاف ورزی کے سلسلے میں مجرم قرار دیا گیا ہے۔ مصنف مسٹر منٹو کو تین ماہ قید بامشقت اور تین سو روپیہ جرمانہ بصورت عدم ادائیگی جرمانہ ۲۱ یوم مزید قید بامشقت کی سزا دی گئی ہے۔ دوسرے دو یعنی مدیر اور ناشر کو صرف تین تین سو روپیہ جرمانہ بصورت عدم ادائیگی تین تین ہفتہ قید بامشقت کی سزا دی گئی ہے۔

یہ تینوں اپیل میں پیش ہوئے ہیں۔
واقعات فیصلہ زیر اپیل میں موجود ہیں۔
مضمون کی طرف حکومت کی توجہ پریس برانچ کے ایک عہدیدار نے مبذول کرائی تھی اور چیف سکرٹری نے قانونی چارہ جوئی کا حکم دیا تھا۔
میں نے فریقین کے فاضل مشیران قانون کو سنا ہے اور ریکارڈ کا مطالعہ کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ملزم کے خلاف جرم ثابت نہیں کیا جا سکا اور سزا برقرار نہیں رہ سکتی۔ میرا خیال ہے کہ مضمون زیر بحث کو فحش اور خاص طور پر خلاف قانون قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ملزمین رسالہ سے اپنا تعلق مانتے ہیں۔ اب طے کرنے کے لیے فقط ایک سوال ہے کہ کہانی فحش اور خصوصاً خلاف قانون ہے یا کہ نہیں۔ اس سلسلے میں کئی نکتے پیدا ہوتے ہیں اوّلاً یہ کہ "فحش" لفظ سے ہم کیا مراد لیتے ہیں۔ دوم یہ کہ یہ ایسا معاملہ ہے جس میں ماہرین کی شہادت پیش کی جا سکتی ہے۔ سوم یہ کہ آیا مضمون زیر بحث قابل اطلاق معیاروں کے مطابق فحش قرار دیا جا سکتا ہے؟ میں نے قانون جرائم ایڈیشن ۱۹۴۵ء میں رتن لال وغیرہ کی کومنٹری دیکھی ہے اور وہاں اٹھائے ہوئے سوالوں پر فریقین کے پیش کردہ دلائل پر غور کیا ہے۔

فحاشی کی جانچ کا معیار وہاں یہ مقرر کیا گیا ہے۔ آیا فحاشی کے تحت الزام زدہ مضمون میں اُن لوگوں کے اخلاق بگاڑنے اور ان کو بُری ترغیب دینے کا میلان ہے۔ جن کے ذہن ایسے غیر اخلاقی اثرات قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔؟ اور جن کے ہاتھوں میں اس قسم کی تصنیف عوام کے اخلاق کے لیے ضرر رساں ہے اور اندازہ کیا جائے کہ وہ جن کے ہاتھ میں پہنچے گی۔ ان

کے ذہن میں بدچلنی اور بدکاری کا اثر پیدا کرے گی تو یہ ایک فحش اشاعت ہوگی قانون کا منشا ہے کہ اس کو روکے۔ اگر کوئی تحریر حقیقتاً کسی ایک بھی جنس کے نوجوانوں یا زیادہ عمر کے لوگوں کے اذہان کو انتہائی گندے قسم کے خیالات سمجھائے تو اس کی اشاعت خلافِ قانون ہے خواہ ملزم کے پیشِ نظر کوئی درپردہ مقصد ہی کیوں نہ ہو جو معصوم حتیٰ کہ قابلِ تعریف ہو۔ کوئی چیز جو جذبات کو مشتعل کرے فحش ہے۔"

پھر ایسے فیصلے بھی ہیں جو قرار دیتے ہیں کہ محض فقروں اور جملوں کو اس لئے معاف نہیں کیا جاتا کہ باقی کی اشاعت ناقابلِ اعتراض ہے اور کہ یہ کوئی جواز نہیں کہ شائع شدہ مضمون کسی ممتاز مصنف کا لکھا ہوا ہے یا ایسے اسلوب میں لکھا گیا ہے جو آسانی سے ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آ سکتا یا یہ کہ اشاعت میڈیکل ہے اور صرف مخصوص گاہکوں کے پاس بیچی جاتی ہے ہمیں نہ صرف تصنیف کی ماہیت کو بلکہ حاضر سماجی حالت کو بھی دیکھنا ہے۔ اگر تصنیف بازار میں آزادانہ مہیا ہو سکتی ہے تو ہمیں یہ طے نہیں کرنا کہ مخصوص یا خواہش سے خریدنے والے گاہک اور پڑھنے والے کون ہیں۔ ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ آیا یہ عوام تک پہنچ سکتی ہے؟ جن میں دونوں جنس کے جوان سال اور بڑی عمر کے لوگ بھی شامل ہیں۔

پس ہمیں تصنیف کی ماہیت کا اپنے سماج کی موجودہ حالت کی روشنی میں تعین کرنا ہے۔ میرے خیال میں اس معاملے کو.... ... اس مقام پر چھوڑا جا سکتا ہے اور ہمیں اس کی طرف بعد میں رجوع کرنا چاہیئے۔ جب ہم اس مسئلے پر غور کر چکیں کہ آیا یہ سوال ماہروں کی رائے سے طے ہو سکتا ہے یا نہیں۔

جہاں تک اس امر کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ معاملہ ماہروں کی رائے

سے ہرگز طے پانے والا نہیں ہیں اس پر غور نہیں کرتا کہ اس کے متعلق کچھ خاص اور ممتاز ادیب کیا رائے قایم کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف ہمیں یہ پڑتالنا ہے کہ پڑھنے والوں پر عام طور سے تحریر و تصنیف کا کیا ردِ عمل ہوگا۔

اگر میرا یہ خیال درست ہے تو فاضل عدالت ماتحت کی ریکارڈ کردہ شہادتوں کا کوئی حصہ اس نکتے کے لحاظ سے قابلِ قبول نہیں رہ سکتا۔ اگر بفرضِ محال ہم ان حضرات جو فریقین یا عدالت کی طرف سے پیش ہوئے، ان کی شہادت کو عام پڑھنے والوں کی شہادت کی حیثیت سے قبول کریں۔ اور کسی ایک فریق کو خاص اہمیت نہ دیں تو ریکارڈ شدہ شہادت عدالت کو کوئی زیادہ مدد نہیں دیتی۔ گواہوں کی ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ زیرِ بحث مضمون انتہائی فحش ہے۔ دوسری جماعت نے اس کے خلاف بیان دیا ہے اور اسے ایک ایسا فن پارہ قرار دیا ہے جس میں کوئی بھی غیر اخلاقی چیز نہیں۔

غور کرنے پر یہ پتہ چل سکتا ہے کہ یہ رائے عین قدرتی فرق ہے۔ مختلف طبقوں کے پڑھنے والوں کا ردِ عمل مختلف ہوتا ہے۔ جب تک ہم بچ کا ایک معیار مقرر نہ کریں جس کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ اتفاقِ رائے پیدا نہیں ہو سکتا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مختلف مزاجوں، عمروں، پیشوں اور مختلف قسم کی تعلیم حاصل کئے ہوئے لوگوں کا ردِ عمل بھی ضرور مختلف ہوگا۔ اور علاوہ اس کے یہ طے ہے کہ اخلاق ایک اضافی اصطلاح ہے۔ فحاشی کے سوال پر نظریات ضرور ایک دوسرے سے مختلف اور نمایاں حد تک مختلف ہونگے۔

میری رائے میں صحیح بات یہ ہے کہ اس مسئلے کو اس "افسانوی آدمی" — پبلک کے ایک عام رکن کے نقطۂ نظر سے جانچنا چاہیئے۔

یہ طے کر چکنے کے بعد ہمیں یہ دیکھنے کے لئے زیرِ بحث مضمون پر غور کرنا

ہے کہ یہ ہمارے سماج کے مسلّمہ اخلاقی نظریات کے خلاف کہاں تک جاتا ہے۔

اس موقعہ پر مجھے زیر اپیل فیصلے کے ایک غلط مفروضے اور گمراہ کرنے والی دلیل کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ فاضل مجسٹریٹ نے اس بیان سے ابتدا کی کہ "فحاشی" کی اصلاح اس ماحول کے ساتھ متعلق ہے جس میں اس کے متعلق فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ مختلف قوموں اور سوسائٹیوں کے معیار مختلف ہو سکتے ہیں۔ یہاں تک وہ درست تھا۔ اس نے غلطی وہاں کی جب اس نے یہ سمجھا کہ پاکستان کے مروجہ اخلاقی معیار قرآن پاک کی تعلیم کے سوا اور کہیں سے زیادہ صحیح طریقے پر معلوم نہیں ہو سکتے۔ پھر وہ یہ کہتا ہے کہ اس کے مطابق "غیر شائستگی شیطان کی طرف سے ہے"۔

اس میں شک نہیں کہ یہ ہمارا آدرش ہے لیکن سوال یہ نہیں ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ ہمارے سماج کی اصلی حالت کیا ہے۔ جیسا کہ ظاہر ہے ہم نے اپنا نصب العین ابھی تک حاصل نہیں کیا۔ اپیل کہنے والوں کو اس کے مطابق جانچنا چاہیئے۔ جس طرح کہ ہماری سوسائٹی ہے نہ کہ اس طرح جیسا کہ اسے ہونا چاہیئے۔

جب ہم سوچتے ہیں کہ کیسی کیسی مطبوعات مارکیٹ میں موجود ہیں جن پر کوئی احتساب قائم نہیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ زیر بحث مضمون کہیں کم قابلِ اعتراض ہے۔ متعدد "اسراری" مطبوعات کی اشاعت کے خلاف کوئی پابندی نہیں جن سے زیادہ اور کوئی چیز فحش نہیں ہو سکتی۔ سینماؤں میں تماشاؤں کی نمائش پر کوئی احتساب نہیں جو زیر بحث مضمون سے کچھ کم قابلِ اعتراض نہیں ہوتے۔ اگر ہمیں مغربی تہذیب کو اپنانا اور اس کو پسند کرنا ہے جیسا کہ ہم کر رہے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ ہم ایسی تحریر پر جیسی کہ ہمارے سامنے موجود ہے معقول طور پر فحاشی کا اعتراض نہیں کر سکتے۔ یہ تو اس تہذیب کا لازمی نتیجہ ہے اور حسب معمول اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

فحش مناظر ایک ایسی چیز ہیں جو ہر روز سینماؤں میں پیش کیے جاتے ہیں۔ بدکاری

وہ عام اور بنیادی زمین ہے جس پر سچی کہانیاں اور دائمی مثلثیں استوار کی جاتی ہیں۔ درحقیقت یہی تمام انگریزی اور مغربی ناولوں کا بنیادی پلاٹ ہے۔ اگر ان پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا تو مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہم کیوں ان نوجوانوں پر سختی کریں۔

زیر بحث کہانی رسالے کے صفحہ ۸۸ سے لے کر ۹۳ تک چھپی ہے۔ قصہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ ایک خاص شخص کا جس کا نام ایشر سنگھ تھا، ایک خاص عورت کلونت کور کے ساتھ ناجائز تعلق تھا۔ اس نے فسادات کے دوران میں ایک مکان میں چھ آدمیوں کو قتل کر دیا تھا اور ایک خوبصورت لڑکی کو وہاں سے اٹھا لایا تھا۔ لیکن اسے پتہ چلا کہ لڑکی مر چکی ہے "ٹھنڈا گوشت" ہے۔ اس کہانی کے مطابق اس انکشاف نے ایشر سنگھ پر ایسا اثر کیا اور اس کے جذبات کو اتنا بدل دیا تھا کہ کلونت کور کے پاس وہ جس مقصد کی تکمیل کیلئے آیا تھا وہ اسے عملی جامہ نہ پہنا سکا۔

اس میں یہاں وہاں کچھ ناشائستہ اصطلاحیں اور کچھ قابلِ اعتراض الفاظ موجود ہیں اور کچھ سوقیانہ گالیاں بھی — بالکل اسی قسم کی جو ہماری سوسائٹی کے نچلے طبقے میں عام ہیں۔

اب کسی مضمون کی ماہیت پر غور کرنے کے لیئے آدمی کو کئی اصطلاحات اور تصریحات کو زیرِ نظر رکھنا پڑے گا۔ مثلاً چند ایک کا نام لیں تو ایک مضمون "باذوق" یا "بدذوق"، "غیر مناسب" یا "سوقیانہ"، "ناشائستہ" یا "فحش" ہو سکتا ہے۔ ان تدریجی رنگوں کے امتزاج کو ایک دوسرے سے الگ ہٹا کر اس مضمون کو جسے فحش قرار دیا جاتا ہو قطعی طور پر "غیر شائستہ"، "غیر اخلاقی"، "ضرر رساں" اور بہت کچھ اور ہونا چاہیئے۔ لیکن زیادہ سے زیادہ جو میں اس مضمون کے متعلق کہوں گا وہ یہ ہے کہ یہ سوقیانہ اور ناشائستہ ہے۔

فاضل پی پی ایس نے کسی ایسے خاص قابلِ اعتراض پیروں کی طرف اشارہ نہیں کیا جس کو وہ یقینی طور پر "فحش" قرار دیتا۔

کسی شخص نے کہانی کی چند سطروں پر نشان لگائے ہیں۔ لیکن وہ ایسی ہی ہیں جن کے متعلق میں پیشتر ذکر کر چکا ہوں اور ان کو دوبارہ پیش کرنے سے کوئی مفید مقصد حاصل نہیں ہوگا۔

مجھے اس لیئے فاضل عدالت ماتحت سے اختلاف ہے لیکن میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا مقصد یہ ہے کہ مجھے اس مضمون سے اتفاق ہے۔ میں اسے "فحش" یا زیادہ قابلِ اعتراض نہیں سمجھتا۔

چنانچہ میں اپیل منظور کرتا ہوں اور تینوں اپیل کرنے والوں کو بری کرتا ہوں۔ وہ پہلے ہی ضمانت پر ہیں۔ جرمانہ اگر ادا کیا گیا ہے تو وہ سارے کا سارا واپس دیا جائے۔

ایک لطیفہ سنیئے۔ گیارہ جولائی کی صبح کو نذیر احمد چودھری مالک "نیا ادارہ" اور مدیر "سویرا" جو دوسرے ترقی پسندوں کے ساتھ مل کر مجھے رجعت پسند قرار دے چکے ہیں اور حلف اٹھا چکے ہیں کہ میری کوئی تحریر اپنے "سویرا" میں شائع نہیں کریں گے۔ تشریف لائے۔ بغل گیر ہو کر بڑی گرمجوشی سے مبارک باد دی اور کہا "منٹو صاحب! اب "ٹھنڈا گوشت" عنایت فرما دیجئے۔ میں "نمرود کی خدائی" میں شامل کر لوں۔"

میں چودھری صاحب کی اس درخواست پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔

چند دن ہوئے کوہاٹ سے ایک صاحب انسپکٹر کیڈٹ مظہر علی خان کا خط

موصول ہوا۔

"مجھے امید ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں کون ہوں۔ ریاض صاحب کی دکان پر آپ سے چند ملاقاتوں ہی نے مجھے آپ کا گرویدہ بنا دیا بہت دن ہوئے میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ آپ کو "ٹھنڈا گوشت" سے نجات مل گئی ہے۔ فرصت کم ہونے کے باعث آپ کو مبارکباد کا خط نہ لکھ سکا۔ اب گو مبارکباد بہت دیر سے ہے لیکن پھر بھی آپ قبول فرمائیں۔ مجھے پکا یقین ہے کہ ایسی مخالفتوں کے باوجود آپ کے مداح بڑھتے ہی جائیں گے۔

سنا ہے چودھری محمد حسین صاحب جو آپ کے ساتھ اکثر نوک جھوک کرتے رہتے تھے اس دنیا ہی سے چل بسے۔ اب تو معاملہ کچھ بے مزہ سا ہو گیا۔ لیکن دنیا میں سر پھروں کی کمی نہیں۔ کوئی اور صاحب ان کی جگہ ضرور سنبھال لیں گے۔"

مجھے چودھری محمد حسین صاحب کی وفات کا بہت افسوس ہے۔ خدا ان کو غریقِ رحمت کرے۔ اب کہ وہ اس دنیا میں نہیں میں ان کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ ان کی جگہ اگر کوئی دوسرا سنبھال لے گا تو میں کہوں گا ــــ

سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

سعادت حسن منٹو

لاہور ۲۹ اگست ۱۹۵۰ء